گلی کوچے
انتظار حسین

افسانے

انتظار حسین

قیوما کی دکان

صبح ہی صبح جب میں لحاف میں منہ لپیٹے پڑا ہوتا اور نیم غنودگی کی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی تو بدھن کی ''دودھ لؤ دودھ'' کی دلاویز صدا دور کی کسی دوسری دنیا سے خواب میں لپٹی ہوئی آتی معلوم ہوتی۔ ادھر اس نے آواز لگائی اور ادھر میری آپا نے مجھے جھنجھوڑا ''اے اٹھے ہے کہ نہیں' جا دودھ لے کے آ۔'' اور میں کروٹ لینے نہیں پاتا تھا کہ پھر ایک وار ہوتا۔ ''ارے اٹھا کہ نہیں' پڑھنا نہ لکھنا شام سے سنا تا ہے' دنیا کے بچوں کو دیکھو بارے بارے بجے رات تک پڑھے ہیں اور پھر اندھیرے سے اٹھ کے کتاب پہ جٹ جاوے ہیں۔ اس کم بخت نے ہر طرح سے ڈوب ڈال رکھی ہے۔'' اور میں قہر درویش بر جان درویش اٹھتا اور گلاس لے کے دودھ لینے چلا جاتا۔ خیر صاحب دودھ لانا میرے ذمے تھا۔ اور میں لا دیتا تھا۔ لیکن بات یہاں آکر ختم تھوڑے ہی ہوتی تھی۔ میں نے دودھ کا گلاس آپا کے ہاتھ میں تھمایا۔ انہوں نے اس غور سے دیکھا' ایک دو جھٹکے دیئے اور پھر چلانا شروع کر دیا۔ ''اے لو مٹے کی باتیں۔ یہ دودھ دیا ہے کمبخت نے۔ نرا پانی۔ جا اسے اس کے منہ پہ مار آ۔ ایسے کوئی مفت کے پیسے آ گئے ہیں۔ ہمارے پاس'' اور دودھ کو اس کے منہ پر مار آنا ہی بس اپن کے بس کا نہیں تھا۔ بدھن ایسا کرئی گیا گزرا تو تھا نہیں۔ اسے تو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ کہ کون اس کا دودھ خریدتا ہے۔ کون نہیں خریدتا۔ اس کے خریدار تو بہتیرے تھے۔ مجھے ذرا بھی دیر ہو جاتی تھی تو وہ ٹکا سا جواب دے دیتا۔ ''دودھ نئیں اے جی اب'' اور پھر آخر ہمارے پاس اس بات کا ثبوت ہی کیا تھا۔ کہ بدھن دودھ میں پانی ملاتا ہے۔ یہ تو دراصل آ ظریات کا فرق تھا۔ اسی دودھ کے لئے بدھن مکھن کی تشبیہ استعمال کرتا تھا اور جب میں گھر لے کر پہنچتا تھا تو آپا اسے ''نرا پانی'' بتاتی تھیں۔ اس نظریاتی اختلاف سے قطع نظر بدھن اپنی قسم کا ایک ہی آدمی تھا۔ لمبا تڑنگا۔ کالا رنگ۔ گٹھا ہوا جسم۔ ہاتھ میں ہر وقت لاٹھی رہتی تھی۔ دودھ دوہتے وقت بکری کی ٹانگ اس انداز سے دباتا تھا کہ مجال نہیں ذرا چوں چرا کر جائے نبوٹ غضب کی جانتا تھا۔ دور دور کے گاؤں میں اس کی لٹھیا کی دھوم تھی۔ بڑے بڑوں کے اس نے سر توڑے تھے۔ اس لئے اس کے دشمن بھی بہت ہو گئے تھے۔ کئی دفعہ تو جنگل میں اسے ڈاکوؤں نے گھیر بھی لیا تھا۔ لیکن بدھن بھلا مار کھانے والا تھا اسے تو اپنی لٹھیا پہ بھروسہ تھا۔ پٹھا بے کھٹکے رات بیرات کو جہاں جی چاہے گھومتا تھا۔ رات کو قیوما کی دکان پہ آ کے اس کی باتیں سنو۔ قیوما کی دکان پہ رات کو بلا ناغہ دودھ پینے آیا کرتا تھا۔ مگر دودھ پینے کے معنی یہ تھوڑا ہی ہیں کہ آئے دودھ پیا کلھڑ پھوڑا پیسے پھینکے اور چلتے بنے۔ قیوما کی دکان پہ دودھ پینے والے تو دودھ کی ثانوی

حیثیت دیتے تھے۔ میں تو آپا کے ڈر کے مارے گیارہ بارہ بجے گھر چلا آتا تھا اور پھر بھی ڈانٹ پڑتی تھی۔ اللہ ہی جانے یہ پھر رات کو کب تک جمی رہتی تھی۔ بدھن، حسینی گدی، رمضانی قصائی، الطاف پہلوان کمرجی اور کہاں تک نام گناؤں سمجھئے کہ محلہ کے سارے چھنٹے چھنٹے آکے بیٹھ جاتے تھے اور پھر وہ زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے کہ بس دیکھا ہی کرو۔ حسینی گدی کی تو خیر الگ بات تھی۔ اس کا تو کام ہی ایسا تھا کہ وہ باقاعدگی سے نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی تو مہینہ دو مہینہ کہ غائب ہو جاتا۔ اور اگر پولیسے کے ہتھے چڑھ جاتا تو سالوں کی خبر لاتا تھا۔ اس کی بات تو کچھ سند باد جہازی کی سی تھی۔ تھوڑے دن کے لئے گھر آیا۔ پیسہ کوڑی گھر میں رکھا۔ قیوما کی دکان پہ معرکے سنائے اور پھر سفر کی نیت سے روانہ ہو گیا۔ الطاف کا یہ تھا کہ وہ پہلوان آدمی تھا۔ بڑی باقاعدگی سے دودھ پینے آتا تھا اور ویسے بھی استاد نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ ''بے الطاف جورو کے پاس گیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا'' سو اس کا بس چلتا تو وہ ساری رات قیوما ایک دکان پر ہی گزارا دیا کرتا۔ الطاف کی کاٹھی اچھی تھی۔ تھوڑے سے دنوں میں اس نے تو وہ رنگ جمایا کہ سارے میں ہوا بندھ گئی اور جب بوا کو اس نے پچھاڑ دیا تو ہر ایک کی زبان پہ الطاف ہی الطاف تھا۔

رمضانی قصائی اگر ایک طرف حسینی کی ٹکر کا تھا۔ تو دوسری طرف بدھن سے بھی کم نہ تھا۔ ہم میں اس کی ذات پہ بڑی بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ جیب کی رائے یہ تھی کہ ''رمضانی کا نام ہی نام ہے۔ بدھن کے تو وہ پیر کے برابر بھی نہیں ہے۔'' لیکن منے کا کہنا یہ تھا کہ ''بدھن تو کل کا چھوکرا ہے۔ لٹھیا کے جو ہاتھ رمضانی کو معلوم ہیں ان کی تو بدھن کو ہوا بھی نہیں لگی ہے'' اور منا اپنی بات کے ثبوت میں بہت تاریخی شواہد بھی پیش کرتا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں شدو کی رائے اعتدال پسندانہ ہونے کے باعث زیادہ وقیع تھی۔ جب جیب اور منے میں بہت زیادہ گرما گرمی ہونے لگتی تو وہ کہتا کہ ''دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ بدھن تکڑا بہت ہے جس کے اس کی لٹھیا پڑ جائے سالا اٹھ نئیں سکتا۔ مگر پھر وہ ابھی کل کا پٹھا ہے۔ رمضانی بہت گھاگھ ہے۔ داؤں اسے بہت یاد ہیں'' اور اس بات کا اثر وہی ہوتا۔ جو مرزا یاسط کے اس جملہ کا ہوا تھا کہ ''ایک کا کلام آہ ہے دوسرے کا واہ ہے۔'' یہ واقعہ بھی ہے جس طرح ہم میر کو سودا پر اور سودا کو میر پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ رمضانی بدھن سے بڑھا ہوا تھا یا بدھن رمضانی سے بڑھا ہوا تھا۔ رہی حسینی اور رمضانی کے مقابلہ کی بات تو بھئی حسینی کی عظمت اسی سے ثابت ہے کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ جیل میں زیادہ رہا ہے یا گھر پہ زیادہ بیٹھا ہے لیکن بہت سی باتوں میں رمضانی اس سے بڑھا ہوا تھا جس طرح کوئی شخص حسینی کے قید میں رہنے کی مدت کا تعین کبھی نہیں کر سکا۔ اسی طرح کوئی شخص رمضانی کی بیویوں کی تعداد بھی ٹھیک نہیں بتا سکتا تھا۔ جب بھی وہ مہم سے واپس آتا تو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بیوی بھی لاتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس محنت کے باوجود کسی نے اس کے گھر میں کبھی دو سے زیادہ عورتیں بیک وقت نہیں

دیکھیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ رمضانی حسینی اور بدھن وغیرہ کا آپس میں موازنہ کرنا غلط ہے۔ ان کی تو اپنی اپنی الگ الگ شخصیتیں تھیں۔ نہ آپس میں کسی سے بڑے تھے نہ کسی سے چھوٹے تھے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان سب کا جمگھٹا قیوما کی دکان پہ رہتا تھا۔ اور جس نے بھی قیوما کی دکان دیکھی ہے۔ وہ حسینی' رمضانی' بدھن' الطاف اور کمر جی کو نہیں بھول سکتا۔ آپ کمر جی کے لفظ پر لاکھ ناک بھوں چڑھائیں۔ لیکن میں تو کمر جی ہی کہوں گا۔ میں کوئی ماہرانہ تو ہوں نہیں کہ یہ تحقیق کرتا پھروں کہ کنور جی بگڑ کر کمر جی کیسے بن گیا اور نہ مجھے زباندان بننے کا خبط ہے۔ کہ زیر بردست کر کے کنور جی کہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ کمر جی کی پوری شخصیت کا اظہار کمر جی' میں ہی ہوتا ہے' کنور جی' میں نہیں۔ کمر جی بھی واقعی کیا چیز تھے۔ انہیں غمگین تو کسی نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجلس میں رونے والوں میں ان کی آواز سب سے بلند ہوتی تھی۔ لیکن اس قسم کی عینی شہادت کوئی نہیں ملتی کہ ان کے آنسو بھی واقعی نکلتے تھے۔ اور پھر غم حسین میں گریہ وزاری تو اپنا ایک الگ خانہ رکھتی ہے۔ اسے آپ عام قسم کے غم وحزن میں خلط ملط کیوں کریں۔ یہاں مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ کمر جی کے خسر کی بطخ کو بلی لے گئی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے ایک بڑا پر سوز نوحہ لکھا تھا اور اگر یہ نوحہ انیس کی بکری کے مرثیہ کی طرح مشہور نہیں ہوسکا تو اسے ان کی بے نیازی سے تعبیر کیجئے یا بدقسمتی سے۔ کم از کم ان کی شعری صلاحیتوں پر اس واقعہ کی بنا پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ دورہ لگانے کا مرض کمر جی کو بھی تھا۔ لیکن وہ دو تین دن سے زیادہ کہیں نہیں نکلتے تھے ہر دورے کے بعد وہ کسی نئے نواب نئے رئیس کا ذکر کرتے آتے تھے اور جب وہ اپنی عقلمندی اور اس نواب کی قدردانی کا ذکر کرتے تو ان باتوں میں ایک دبی دبی حسرت جھلکتی کہ کاش وہ بھی کسی راجہ مہاراجہ کے مصاحب ہوتے۔ انہیں اس بات کا احساس کبھی نہ ہوا۔ کہ قیوما کی دکان کے پڑے پہ ان کی حیثیت خود ایک راجہ کی سی تھی۔ کمر جی کو دوسروں کو آپس میں لڑانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بس ان کا کام تو یہ تھا کہ کوئی شوشہ چھوڑ دیا اور پھر لوگ باگ آپس میں گتھ جاتے تھے اور کمر جی تماشہ دیکھتے رہتے تھے۔ اگر ان بحثوں کا کبھی کوئی پتا تلا نتیجہ نہ نکلا تو یہ ایک الگ بات ہے۔ الطاف اپنے خلوص اور عقیدتمندی کے باوجود کبھی یہ ثابت نہ کرسکا کہ اس کا استاد بنے کلو خاں سے اچھا لڑتا ہے۔ یوں بحثیں تو بہت ہوئی ہیں اور حسینی نے اپنی صفائیاں بھی بہتری پیش کی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ آج بھی اتنا ہی پر اسرار اور اتنا ہی لاجھا ہوا ہے کہ نواتنلی والے کے پاس اتنے دونے منڈوے اڑانے کو پیسے کہاں سے آئے تھے۔ بات کبھی کبھی سیاست پر بھی پہنچ جاتی تھی۔ صدیق نائی اگرچہ "انجام" بلاناغہ پڑھتا تھا اور ممبر صاحب کی بیٹھک میں حجامت کے دوران میں اس نے سید بھائی کی بصیرت افروز سیاسی بحثوں سے استفادہ بھی کیا تھا۔ پھر بھی وہ بدھن کو کبھی قائل نہ کرسکا۔ یوں صدیق اسے اپنی علمیت کے زور سے گھیرے میں لے آتا تھا۔ لیکن بدھن کا ایک آخری حربہ اتنا مؤثر تھا کہ صدیق چاروں خانے چت گرتا تھا۔ بدھن کا کہنا "بس جی۔ ہمیں تو تم

ایک بات بتادو۔ یہ تمہارے جہنا صاحب ڈاڑھی کیوں نہیں رکھتے۔"

اور یہاں آکر صدیق واقعی بغلیں جھانکنے لگتا۔ لیکن رمضانی نے ایک روز اس بات کا بڑا منہ توڑ جواب دیا کہنے لگا کہ "بھیا یہ جتنے تمہارے مولبی ڈاڑھی رکھے پھرے ہیں۔ سب ڈاڑھی کی اوٹ میں شکار کھیلے ہیں۔"

بدھن کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی کہنے لگا۔ "دیکھ بے رمضانی علماؤں کی شان میں بے ادبی کی ہوئی تو تو ہی جانے لگا۔"

رمضانی بولا۔ "ابے سچی بات کہہ دی تو تتیے لگ گئے؟"

"بیٹا تتیے تیرے لگ گئے یا میرے لگ گئے۔"

بدھن بولا۔ "جواب نہیں بن پڑا تو علماؤں پہ آگیا۔ ابے یہ تمہارے جہنا صاحب مسلمانوں کے لیڈر بنے ہیں۔ نماز یہ نہیں پڑھتے۔ روزہ نہیں رکھتے اور بھی خدا کی قسم انگریز سے انہیں تنواہ ملتی ہے۔"

"پیارے یہ بات تمہارے علماؤں میں ہے۔ ایک ایک علماء کی کانگرس سے تنخواہ بندھی ہوئی ہے۔ مزے کرتے ہیں پٹھے۔"

"دیکھ بے رمضانی زبان سنبھال کے بول۔" بدھن پھر بھنایا۔

رمضانی کو بھی طیش آگیا۔ "ابے ہے کس بھلائے میں تو۔ چیر کے دو کردوں گا سالے۔"

کمر جی نے جو دیکھا کہ بات بگڑتی ہی جارہی ہے فوراً بیچ میں آگئے۔ "ابے سالا سٹہ کیا کرتا ہے۔ کونسی تو نے بہن بیاہ دی ہے۔ مجھے اپنی۔ اور او بے بدھن تجھ میں بڑی گرمی آرہی ہے۔ سالے بیاہ کیوں نہیں کر لیتا۔ اور کوئی نہیں تو سلو ہی سہی اگر جھینگی ہے تو کیا ہے۔ ویسے تو پھول کے دنبہ ہو رہی ہے۔"

اور پھر تو چاروں طرف سے وہ قہقہے پڑے کہ بدھن اور رمضانی دونوں اچھے خاصے احمق نظر آنے لگے اور کھسیانے ہو گئے۔ کمر جی نے پھر اپنا رخ دوسری طرف پلٹا۔ "ابے او بے اسماعیل والے۔ یہیں سوئے گا کیا۔ گھر نہیں جاتا۔"

"ڈر لگے ہے کمر جی" بندو نے کہا۔

اور منا فوراً بولا۔ "ابے بندو پیپل کے سامنے سے سنبھل کے نکلیو۔"

حسینی نے ڈانٹ بتائی۔ "کیوں ڈراتا ہے بے لونڈے کو۔ جا بندو بھیا چلا جا۔ کچھ بھی نئیں ہے یہ تو سالا بکتا ہے۔"

"پیارے اس بھلائے میں مت رہیو۔ مارے کھا جاؤ گے" الطاف بولا۔

"ہاں کھالی مار۔"

''اچھاجی یاں بیٹا۔تمہارا چقو کام نئیں آئے گا۔''

''الطاف بھیا چپکا بیٹھا رہ نا۔کیوں بحث کرے ہے۔صبح شام گئے ڈنڑ پیل آئے قیوما کی دکان پہ آ کے گپیں مارلیں۔تو نے دینا دیکھی کاں ہے۔ابے ہماری تو عمر ہی ان چکروں میں گزری ہے۔وہ یاد نئیں اے۔جب پرار کے سال میرے پیچھے پولیس لگ گئی تھی۔تو ڈیڑھ مہینہ تک ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں پڑا رہا تھا۔حفیظا وخت بے وخت آ کے کھانا دے جاتا تھا۔چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں مگر یار جی کو تو کچھ بھی نہیں ہوا۔''

الطاف بولا۔''اجی یہ تو اتفاق ہے کہ کچھ نئیں ہوا۔اگر کچھ ہو جاتا تو ساری مردمی رکھی رہ جاتی۔''

''اچھا جی جیسے ہم نے کچھ دیکھا ہی نئیں ہے۔بھئی قسم اللہ پاک کی ایسے ایسے جنگلوں میں گھرا ہوں۔جہاں آدم ہوتا تھا نہ آدم ذات۔بیٹا تم ہوتے تو کلیجہ پھٹ جاتا۔ایک دفعہ تو مہینہ بھر تک جھاڑیوں میں چھپا پڑا رہا۔سالا جنگل سائیں سائیں کرے تھا اور وہاں ایک تکیا جو تھی۔واں سے تو کلام مجید کی قسم رات بھر''چھیو چھیو'' کی آواز آتی تھی آخر جی ایک دن میں اٹھ کے چلا۔رات کے بارے بجے ہوں گے۔چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا اماں کیا دیکھوں ہوں کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی چلا آریا اے۔میں نے سوچا' ہو گا کوئی سالا گنوار۔بچ کے نکل جاؤں۔سو جی میں کھیت کی ڈول ڈول ہو لیا۔اماں تھوڑی دیر بعد کیا دیکھوں ہوں کہ سالا پھر سامنے سے چلا آریا اے۔اور آنکھ جو جھپکوں ہوں تو کھٹ سے میرے سامنے کہنے لگا کہ پنجہ لڑا لے۔ہم نے کہا کہ آجا سالے۔بس ڈٹ گئے۔نہ ہمارے پنجہ مڑے نہ اس کا بھئی قسم اللہ پاک کی اس ہاتھ لوہا تھا لوہا میں بھی سوچوں کہ یہ کونسا جودھا آگیا جو ہم سے ٹکر لیوے ہے۔اس کے پیروں کو جو میں نے دیکھا تو میری ہوا ہی تو کھسک گئی۔اس کے تلوے آگے اور پنجے پیچھے۔میں نے جناب قل پڑھنی شروع کر دی۔اور زور کیے گیا۔تھوڑی سی دیر میں سالا خحناتا ہوا بھاگا۔''

''کوری گپ''رمضانی نے فتویٰ لگایا۔

''بھئی اللہ پاک قسم جو ذرا سا بھی جھوٹ ہو''حسینی نے حلفیہ انداز میں کہا۔

''اچھا تو تو جمعرات کی شام کو اس پیپل کے نیچے سے نکل کے دکھا۔''الطاف بولا۔

''اور نکل گیا تو؟''

''پر جی شرط یہ ہے کہ سر میں چنبیلی کا تیل ڈال کے اور ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لے کر نکلو۔''

''رئی۔بول کیا کھلائے گا؟''

''اُٹھنی کے پیڑے۔''

''رئی؟''

''رئی''

''کمر جی! سن رئے او۔ گوار ینا۔''

کمر جی قیوما کی دکان پہ نہ معلوم کتنی شرطوں کے گواہ رہ چکے ہیں' یہ اور بات ہے کہ ان میں سے شاید ہی کسی شرط کے پورا ہونے کا توقعہ آیا ہو۔ لیکن قیوما جیسا بے نیاز آدمی بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے کیا مطلب کچھ ہی ہوا کرے اسے تو اپنی دودھ کی کڑھائی اور کڑھائی کے نیچے جلتی ہوئی آگ سے مطلب تھا۔ دنگل کی باتیں ہوتی رہتیں اور جن پری کے قصے چلتے رہتے۔ اور کبڈی اور گلی ڈنڈے کے میچوں پہ تبصرے ہوتے رہتے اور قیوما اسی ایک انداز میں آنکھیں جھپکتے ہوئے دودھ چلاتا رہتا وہ آگ پھونکتا اور پھر دودھ چلانے لگتا اور پھر کسی کو دودھ دینے لگتا پھر یکایک کوئی لونڈا آتا اور آتے ہی ساری دکان سر پہ اٹھالیتا۔ ''ارے قیوما۔ قیوما۔ جلدی دے نا دو پیسے کی چاء ارے دیتا ہے یا نہیں'' خواہش تو اس کی یہ ہوتی کہ جتنی دیر لگ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک ہاتھ اس کا پیسے بجاتا اور دوسرا ہاتھ بڑی خاموشی سے نقلوں کی تھال کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔ قیوما نے آج تک کسی لونڈے کو نہیں ٹوکا' اگر چہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنی نیکی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا یا مروت میں مارا جاتا تھا۔ یا اس کی بھٹی سے نکلتا ہوا دھواں اسے کچھ نہیں دیکھنے دیتا تھا۔ میں تو قیوما کو نیک ہی کہوں گا۔ اگر چہ میری یہ رائے میری آپا کی رائے کی بالکل متضاد ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ قیوما کے دودھ کی دبیز ملائی سنگھاڑے کی مینگ کی مرہون منت ہوتی تھی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے پیڑوں میں ماوا کم اور شکر زیادہ ہوتی تھی۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ اس کے گھر میں مونگ پھلی کے تیل کا میل ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے قیوما کی نیکی پر آخر کیا اثر پڑتا ہے اور کیا بات یہ بھی تو ہے کہ میری آپا کی تنقید تو ہر ایک کے متعلق ہی کچھ تخریبی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ بدھن کا دودھ نرا پانی ہوتا تھا اور قیوما کے گھی میں ملاوٹ ہوتی تھی اور رمضانی بھینس کا گوشت دیتا تھا۔ حالانکہ رمضانی تو میرا بہت ہی لحاظ کرتا تھا۔ جہاں میں پہنچا اور اس نے آواز لگائی ''شیخ جی آج بڑا تگڑا جانور کیا ہے۔ کیا یاد کرو گے۔ بس جی میرے کہنے سے آج ہنڈیا میں گھی مت ڈلوئیو' میں گوشت لے کے خوش خوش گھر آتا۔ آپا نے جہاں کھول کے دیکھا اور آسمان سر پر اٹھالیا۔ ''اے ہے مٹے نے بھینسے کا گوشت دے دیا ہے جا ماریا اسی کے سر سے۔'' اور ایک آفت ہو تو بھگتی جائے۔ اگر وہ بیچارہ ران کا گوشت دیتا تو اعتراض یہ ہوتا کہ بالکل روکھا ہے۔ ذرا سی بھی تو چکنائی نہیں ہے۔ اگر دوسرے دن ردعمل کے طور پر سینہ کا گوشت دیتا تو شکایت یہ ہوتی تھی کہ

''اے ہے نری ہڈیں گڈئیں ہیں۔ بوٹی تو نام کو نہیں ہے۔'' تو میرے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپا تو کچھ قنوطیت پرست واقع ہوئی تھیں۔ ہاں بھگت جی کے سودے کے متعلق ان کی رائیں بالعموم رجائیت پسندانہ ہوتی تھیں مگر بھگت جی کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ سارے محلہ میں ہی ہردلعزیز تھے۔ بھگت جی کی دوکان کی دالیں بڑی چھانی پھٹکی ہوتیں۔ آٹا کھرے گیہوں کا۔ گھی میں کیا مجال کہ ذرا ملاوٹ ہو۔ اور پھر اگرچہ وہ بنتے تھے مگر بالکل ٹھیک تولتے تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ دن میں کتنی ہی مرتبہ تم سودا لینے جاؤ اور چاہے دھیلے کا ہی سودا لو لیکن بھگت جی اسی ایک قد کی سنہری گڑ کی ڈلی ہر دفعہ ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ پھر اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ان کی دکان کا تختہ اتنا نیچا تھا کہ ہم اچک بیٹھ سکتے تھے۔ ورنہ بعض ناعاقبت اندیش دکانداروں نے اتنی اونچی اونچی دکانیں لے رکھی تھیں کہ اس کے پتھر تک بس ہماری گردن پہنچتی تھی۔ بھگت جی کی دکان پہ تیج بڑی باقاعدگی سے آتا تھا۔ اور وہ اسے خود ہی نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ دوپہر کو آس پاس کے دوکانداروں کو جمع کر کے اس خبریں ہلکی ہلکی حاشیہ آرائی کے ساتھ پڑھ کر سناتے تھے۔ مختصر یہ کہ سیاسی' سماجی' معاشی' اخلاقی' جغرافیائی غرض ہر اعتبار سے بھگت جی کی دکان بہت خوب تھی۔

لیکن پھر بھی وہ بات کہاں جو قیوما کی دوکان میں تھی۔ دوکان ان باتوں سے دوکان تھوڑا ہی بنتی ہے۔ قیوما کی دکان کی تو کچھ بات ہی اور تھی۔ رہا خوش اخلاقی اور دیانتداری کا معاملہ تو بھگت جی سے بڑھ کے بنا عطار تھے۔ کھانسی کی گولیاں اور پیٹ کے درد کا چورن تو وہ لوگوں کو بالکل مفت دیتے تھے۔ بے چارے نیک اور بقول شخصے بڑے پکے مومن تھے اور پکے مومن ہونے کی وجہ سے ہی ان میں یہ عیب پیدا ہو گیا تھا کہ محرم کے دنوں میں ان کی دکان زیادہ تر بند پڑی رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے تو اپنا کچھ فرض سا سمجھ رکھا تھا کہ ہر مجلس میں شریک ہوں گے اور نہ صرف شریک ہوں گے بلکہ روئیں گے بھی۔ ورنہ قاعدہ کی بات یہ ہے کہ کسی مجلس شریک ہوئے کسی میں نہ ہوئے اور جس میں شریک اس میں ضرور ہے کہ روئیں بھی ضرور وقت اور مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے۔ ایک شیخ جی بھی تو تھے کہ چوپال کی مجلس کے سوا کبھی کہیں نہیں روئے۔ صوبیدار صاحب ویسے بڑے حیدری تھے۔ لیکن ان پہ رقت اپنے امام باڑے میں ہی بیٹھ کر طاری ہوتی تھی اور کمر جی کی تو خیر قدریں ہی الگ تھیں۔ وہ رونے میں بھی ان کا ضرور لحاظ رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ مجلس میں شریک ہونے اور رونے کے معاملے میں نبا عطار جتنے ناعاقبت اندیش تھے۔ اتنا شاید ہی دینا میں اور کوئی ہو۔ وہ تو یہ کہئے کہ محرم کے زمانہ میں خوش قسمتی سے بہت سوں کو مخصوص طور پر کھانسی' زکام اور بدہضمی کی شکایات ہو جاتی ہیں۔ ورنہ ان کی دکان دس دن تک پٹ پڑی رہا کرتی۔ اونچے والوں کے یہاں کی مجلس ختم کی اور لپک جھپک آئے اور دکان کھولی۔ ان کا انداز ہی بتا دیتا تھا کہ اس وقت دکان اپنے فائدہ کے لئے نہیں۔ بلکہ خلق خدا بالخصوص مومنوں کے فائدہ کے لئے کھولی جا رہی ہے۔ کسی کو ذرا سا چورن دیا' کسی کو

گولیاں دیں۔ کسی نے آ کے شکایت کی کہ "کیا بتاؤں جی نیاز کے ذرا سے چاول کھائے تھے۔ اسی وقت پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔" انہوں نے جلدی ایک دو باتیں پوچھیں اور کوئی چیز دے دی۔ کسی نے کہا کہ "جی رات سبیل کا شربت پی لیا تھا۔ ٹھنڈے سے زکام ہو گیا۔" اور انہوں نے چٹکی بٹی دے کے اسے بھی چلتا کیا۔ اور تھوڑی دیر میں دکان کو تالا لگا یہ جا وہ جا۔

یہ بات تو ہم نے قیوما کی دکان ہی میں دیکھی کہ کچھ ہو جائے۔ اس کی دکان بند نہیں ہوتی تھی۔ آندھی آئے۔ مینہ آئے، مجلس ہو، میلاد ہو، شادی ہو کچھ ہو اس کی دکا آن کھلے اور پھر کھلے اور کھلنے کا سوال ہی کیا تھا۔ اس کی دکان بند ہوتی ہی کب تھی۔ میں رات کو بارہ بارہ ایک ایک بجے اسے یونہی کھلا چھوڑ گیا ہوں اور جب صبح اٹھ کر منہ دھونے کے لئے مسجد سے گرم پانی لینے گیا ہوں تو اس کی دکان کو کچھ اسی طرح کھلا پایا ہے۔ قیوما کی دکان کے عین سامنے گل محمد صاحب کا امام باڑہ تھا۔ یہاں محرم میں کچھڑا بٹتا تھا اور بارہ وفات کے زمانہ میں میلاد ہوتے تھے۔ اور میلاد تو خاص طور سے حافظ جی کی طرف سے ہوتا تھا۔ بدائیوں کے پیڑے بٹتے تھے۔ بلا کی خلقت ٹوٹتی تھی۔ اور جو کور کسر رہ جاتی تھی وہ یا نبی سلام علیک' کی آواز پوری کر دیتی تھی اس سارے ڈرامہ میں ایک لمحہ وہ آتا تھا۔ جب سارا ہنگامہ سمٹا ہوا امام باڑہ کے پھاٹک کے پیچھے لہریں لے رہا ہوتا اور سامنے کا چبوترا بالکل خالی ہوتا۔ مگر قیوما اسی طرح ٹٹروں ٹوں بنا ہوا دودھ چلا رہا ہوتا۔ آگ پھونک رہا ہوتا۔ کیا مجال کہ کبھی اٹھ کے اپنا حصہ لے آئے اس کا حصہ تو وہیں آ جاتا تھا۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ قیوما کا یہ استقلال' یہ بے نیازی' یہ پابندی وقت تاریخ میں یادگار رہے گی اور اس کی دکان تو خود بہت بڑی تاریخ کو اپنے سینہ میں بند کئے ہوئے تھی۔ اگرچہ یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ ہماری زندگی میں کونسا روحانی یا سیاسی انقلاب رونما ہونے والا ہے اور یہ کہ اس انقلاب کی روئیں اس کی دکان کے پڑے سے کیسے پھوٹ رہی ہیں۔ لوگ باگ اچھے برے ہر طرح کے مقاصد لے کر اس پڑے پہ آ کر بیٹھے اور بیٹھے رہتے۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے تھے جن کے جسم پڑے پہ ہوتے اور روحیں سامنے والی گلی میں ہوتیں۔ قیوما ان کی روح و قلب کے طوفان سے بے نیاز ہمیشہ اپنے اسی ایک کام میں لگا رہتا۔ اس نے اس پراسرار مسئلہ کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ کہ اس کی دکان کے سامنے مخصوص طور پر کیوں چند نقاب اٹھتے ہیں اور چند نقاب گر پڑتے ہیں۔ اس نے اس گتھی کو بھی سلجھانے کا کبھی ارادہ نہ کیا کہ آخر نواتیلی والا اتنا دودھ اور مٹائیاں جو اڑا جاتا ہے۔ اس کے پیسے حسینی کیوں چکاتا ہے۔ اس نے یہ بھید بھی کبھی سمجھنا نہ چاہا کہ یہ بعض لڑکے اس کی دودھ کی کڑھائی کی طرف پشت کر کے کیوں گھنٹوں ایک زاویئے سے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کی نگاہیں سامنے والی گلی کی ایک مخصوص کھڑکی پر جمی رہتی ہیں۔ قیوما کی دکان کھلی رہتی تھی اور لوگ اس سے فیض یاب ہوتے تھے۔

لیکن وقت بدلتے ہوئے بھی کیا دیر لگتی ہے میں نے اپنی انہیں آنکھوں سے قیوما کی دکان کو بند پڑے دیکھا ہے۔ اب کسی کو یقین تو کاہے کو آئے گا۔ لیکن میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ قیوما کی دکان میں واقعی تالا پڑ گیا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نہ تو قیوما کا دیوالہ نکلا تھا نہ اس کے گھر میں کوئی موت ہوئی تھی اور نہ وہ بیمار پڑا تھا اور نہ قید ہوا تھا۔ پھر ایسی بات ضرور تھی کہ اس کی دکان بند پڑی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس روز بھگت جی کی دکان بھی بند تھی اور چوک میں آلھا اودل پڑھنے والی چوکڑی بھی نہیں جمی تھی اور بنا عطار کی دکان میں بھی تالا پڑا ہوا تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس دن عشرہ نہ تھا اور رمضانی کی دکان پہ بھی پردے لٹک رہے تھے اگرچہ وہ کسی مہم پہ گیا ہوا نہیں تھا اور اس روز بدھن کی دودھ لو دودھ لو کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی اور الطاف بھی زور کرنے لئے اکھاڑے نہیں گیا تھا۔ میں اپنے گھر کے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا بھگت جی کی دکان بھی بند تھی۔ بنا عطار کی دکان بھی بند تھی۔ چندو پنواڑی اور فقرا حلوائی اور نتھو سنار کی دکانیں بھی بند تھیں اور قیوما کی دکان بھی بند تھی۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ قیوما کی دکان واقعی بند پڑی تھی۔ اس کے پڑے پہ ایک کتا نیم غنودگی کے عالم میں لیٹا تھا۔ یہ بات میرے کیا کسی کے خواب وخیال میں نہیں آئی تھی کہ قیوما کی دکان ایک روز بند پڑی ہوگی لیکن قیوما کی دکان واقعی بند پڑی تھی۔ یہ بات میں نے دیکھی تھی۔ سب نے دیکھی تھی۔

تین دن تک بھگت جی اور بنا عطار اور چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی کی دکانیں بند پڑی رہیں اور قیوما کی دکان بھی بند پڑی رہی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور کچی گلیوں کا وہ مختصر سا جال بھی ویران پڑا رہا۔ جو بھگت جی کی دکان کو بنا عطار کی دکان سے اور بنا عطار کی دکان کو چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی کی دکان سے اور چندو پنواڑی اور فقیرا حلوائی کی دکانوں کو قیوما کی دکان سے ملاتا تھا۔ وہاں چلتے پھرتے اب یا تو کتے دکھائی پڑتے تھے یا سپاہی۔ چھوٹی بزریا میں اور چوک میں اور مسجد کے پیچھے والی گلی میں خاک اڑ رہی تھی اور بڑی حویلی کے سامنے والے چبوترہ کی چکنی چپڑی سطح پر گرد کی موٹی تہیں ایسے جم گئی تھیں۔ جیسے کسی پیاسے کے ہونٹوں پہ پڑیاں جم جاتی ہیں۔ چھوٹی بزریا اور چوک اور مسجد کے پیچھے والی گلی اور بڑی حویلی کے سامنے والا چبوترہ ہی ویران نہیں پڑا تھا۔ بلکہ ان کے اوپر والا آسمان بھی ویران تھا۔ ورنہ یہاں تو اتنی پتنگیں اڑتی تھیں کہ سارا آسمان ان سے ڈھکا ہوا دکھائی پڑتا تھا۔ چھتوں اور کوٹھوں پہ لڑکوں کا وہ ہجوم ہوتا تھا۔ اور وہ غل مچتا تھا کہ ساری فضا گونجتی ہوئی معلوم پڑتی تھی۔ یہاں کا آسمان صاف تو شاید ہی کبھی دکھائی دیا ہو پتنگیں نہیں اڑتی تھیں۔ تو شمی کے اور جیب کے اور فجی کے کبوتر اڑتے تھے۔ سفید سفید معصوم کبوتر فضاؤں میں بلند ہوتے جاتے اور چھوٹے ہوتے چلے جاتے یہاں تک کہ تارا بن جاتے اور آسمان میں چپکے ہوئے معلوم ہوتے۔ لیکن آج شمی اور جیب اور فجی کے کبوتر بھی نہیں اڑ رہے

تھے۔ بنیاد کا چاند تارا ابھی نہیں اڑ رہا تھا اور چھوٹے لال اور نہال کے پیچ بھی نہیں لڑ رہے تھے۔ چوک میں گلی ڈنڈا ابھی نہیں ہو رہا تھا اور چبوترہ پہ گولیاں بھی نہیں کھیلی جا رہی تھیں۔ چوک آج ننگا ننگا سا دکھائی پڑتا تھا۔ چوک بھی ننگا تھا اور مسجد کے پیچھے والی گلی بھی ننگی تھی۔ اور چھتیں بھی ننگی تھیں اور آسمان بھی ننگا تھا اور قیوما کی دکان کا پڑا بھی ننگا تھا۔ ہم خود ہی جو ننگے ہو گئے تھے۔

خدا خدا کر کے کرفیو ٹوٹا اور لوگ گھروں سے ایسے بے تحاشا نکل رہے تھے۔ جیسے ڈربے سے مرغیاں یا کابک سے کبوتر نکلتے ہیں۔ شام کو جب میں قیوما کی دوکان پہ گیا تو...... اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس 'کو' کے آگے کیا کہوں۔ قیوما کی دکان واقعی بند نہیں تھی۔ اس کے کنواڑ کھلے ہوئے تھے۔ اور اگرچہ کڑھائی میں دودھ کم تھا۔ لیکن قیوما عین مین اسی انداز سے دودھ چلا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پڑے باسی تھے اور نقلوں کا رنگ بھدا پڑ گیا تھا۔ ورنہ تھالیں تو اسی پرانے قرینے سے چنی رکھی تھیں۔ اور پھر بھی جب میں یہ سوچتا ہوں کہ قیوما کی دکان کھلی ہوئی تھی تو میری آنکھوں میں تو مرے ناچنے لگتے ہیں۔ بدہن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اپنی پرانی ٹھیکوں پر بیٹھے تھے۔ لیکن آج انہیں چپ لگ گئی تھی اور کمر جی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چنن گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا اور قیوا سے دو پیسے کی چاء مانگ رہا تھا۔ آج واقعی اس کا یہ ارادہ معلوم ہوتا تھا کہ چائے کی پڑیا لے کے جلدی سے گھر چلا جائے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیسے بج رہے تھے اور دوسرا ہاتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خشک ہو گیا ہے اور نقلوں کی تھال پہ مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ بدہن نے حقہ بھی بھر کے رکھ دیا تھا اور وہ اونچے پایوں والی بنچ بھی حسب معمول بچھا دی تھی۔ پھر بھی ٹکنے کا کوئی کام نہ لیتا تھا۔ لوگ جلدی جلدی سودا سنبھالتے اور پیسے پھینکتے اور گلیوں میں سٹک جاتے اور پھر کنواڑوں کے دہاڑ دہاڑ بند ہونے کی آوازیں آتیں۔

رمضانی آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ''مگر جی کیسر والوں نے بھی کر دیا کمال۔''

''اور نہیں تو اب تک تو یاں ہلہ بھی بول دیا جاتا'' الطاف نے جواب دیا۔

''بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ کیسر والے نکلے جیدار۔''

بدھن تنک کے بولا۔ ''اور جی ہم تو بالکل ہیچ ہیں۔ پیارے ایک دفعہ ہو جانے دے سالوں کے توس نہیں بکھیر دیئے تو بات نہیں۔''

رمضانی نے جواب نہ دیا۔ الطاف اور حسینی اور کمر جی بھی چپکے رہے۔ قیوما بھٹی کی بجھی ہوئی آگ برابر پھونکتا رہا۔

بدہن پھر بڑبڑانے لگا۔ ''آمنے سامنے کی نئیں ہوتی۔ ہم بھی تو دیکھیں کونسا مائی کا لال ہے۔ جو ٹکتا ہے۔ کیوں حسینی بولتا کیوں نہیں اے بے۔''

''ہوں۔اوں۔'' حسینی پھر چپکا ہو گیا اور الطاف اور حسینی اور کمر جی گم متھان بنے بیٹھے رہے اور قیوما بدستور آگ پھونکنے میں مصروف رہا۔

''اس سالے کی تو میا میری جاری۔ اے ناک چھدا کے جوروا کے پاس بیٹھ جا۔'' پھر بدھن چپکا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا تناؤ دھیما پڑتا چلا گیا۔ اس کا جسم کچھ سکڑنے لگا اور اس کی نگاہیں ٹھنڈے دودھ پر جم گئیں۔ پھر وہ بے حرکت بن گیا اور اس کی نگاہیں ٹھنڈے دودھ پر جمی رہ گئیں۔

بدھن بت بن گیا تھا۔ رمضانی اور الطاف اور کمر جی بھی بت بن گئے تھے اور قیوما بدستور بجھی ہوئی آگ پھونکے جا رہا تھا اور چولہے سے دھواں برابر اٹھے چلا جا رہا تھا اور بدھن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اور کمر جی کے چہرے دھندلے دکھائی پڑ رہے تھے۔ اور پوڑیوں اور پیڑوں کی تھالوں پر بھی دھند چھا گیا تھا۔ گل محمد کا امام باڑہ بھی دھندلا دھندلا نظر آتا تھا اور سامنے والی گلی کا وہ دریچہ بھی ملگجا سا معلوم دے رہا تھا اور مسجد کے سیاہی آلود سفید مینار بھی دھند میں اٹے دکھائی پڑتے تھے۔ پھر کمر جی ایکا ایکی چونک پڑے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہیں چپکے سے کھسک گئے تھے اور اچانک ہمارے درمیان پھر آ گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ ''ابے قیوما آج دودھ تو تو پلا چکا۔ ابے کہاں سے یہ ایندھن اٹھا لایا ہے۔ سالا۔ سارا دھواں ہی دھواں کر دیا'' اور پھر کمر جی چپکے ہو گئے گویا ان کے جملے اپنا جواب آپ ہیں۔ قیوما جواب میں اور زور زور سے آگ پھونکنے لگا۔ لیکن شاید کہہ رہی تھی کہ اب میں نہیں جلوں گی کبھی نہیں جلوں گی۔

بدھن اور حسینی اور رمضانی اور الطاف کو کیا ہو گیا تھا اور کمر جی کی زبان کو کیوں تالا لگ گیا تھا۔ یہاں کب کب معرکے نہیں پڑے تھے۔ بدھن اور حسینی اور رمضانی نے یہ معرکے مارے تھے اور میں نے یہ معرکے کچھ دیکھے تھے کچھ سنے تھے اور میں نے تو انہیں بڑی بری حالتوں میں بھی دیکھا ہے مجھے وہ دن بھی یاد ہے۔ جب بدھن کا سارا کرتا خون سے شرابور ہو رہا تھا اس کی کھوپڑی سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اور پھر اس کی آنکھوں میں بھی خون اتر رہا تھا۔ میں وہ دن بھی نہیں بھولا ہوں۔ جب میں صبح ہی صبح گوشت خریدنے گیا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ رمضانی کی دکان باسی پڑی ہے اور ایک کتا سوکھی ہوئی ہڈی کو دانتوں سے توڑ رہا ہے۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ رمضانی ایکا ایکی کہاں اڑ گیا ہے اتنے میں منے میرے پاس دوڑ ہوا آیا اور بدحواسی کے عالم میں بولا۔ ''ابے رمضانی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ شفا خانے میں پڑا ہے'' اور پھر ہم دونوں شفا خانے اڑے چلے گئے۔ رمضانی کی بری حالت تھی۔ اس کا سارا بدن لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ہڈی پہ بہت ضربیں پڑی تھیں۔ وہ مار درد کے کراہ رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے

تھے اور اتنے میں ڈاکٹر جوشی اور اس کے پیچھے وہ گول مٹول کمپونڈر مرہم پٹی کا سامان لے کے چلا آیا اور ہم باہر کھسک آئے۔ باہر نیم کے نیچے لونڈے کھڑے تھے۔ اور بڑی سنجیدگی سے اس حادثہ پر بحث ہو رہی تھی مجو کا کہنا تھا کہ کھیت کے بیچ میں سے نکل رہا تھا۔ ایک کسان نے اسے ٹوک دیا۔ رمضانی نے اسے گالی دے دی اور اس بات پہ سارے گاؤں والے اس پر ٹوٹ پڑے۔ جیب کا قیاس یہ تھا کہ گنگا کے میلے پر گدیوں کی ایک ٹولی سے لڑائی جو ہوگئی تھی اور جن کی رمضانی نے خوب ٹھکائی کی تھی۔ یہ انہوں نے اپنا بدلہ لیا ہے۔ مگر منے کو یقین تھا کہ ہو نہ ہو یہ ان ڈاکوؤں کی کارستانی ہے۔ جن سے رمضانی کی پارٹی کی ایک دفعہ جنگل میں ٹکر ہوگئی تھی۔ اور جن سے سارا روپیہ پیسہ اور زیور رمضانی نے دھروا لئے تھے۔ لیکن اس بات پہ سب متفق تھے کہ یہ بلا رمضانی پر محض اس وجہ سے ٹوٹی ہے کہ اس کے پاس اس وقت لاٹھی نہیں تھی اور جب منے نے یہ کہا کہ ''رمضانی کہیں اچھا ہو گیا تو ایک ایک کے بکل اڑا دے گا۔'' تو یہ بھی گویا اس نے سب کے دلی جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ زخمی رمضانی کی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں۔ لیکن رمضانی آج اچھا بھلا تھا اور پھر بھی اس کی آنکھوں میں مردنی تیر رہی تھی اور بدھن کے سر سے خون کا فوارہ نہیں چھوٹ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا جی چھوٹا جا رہا تھا اور حسینی کے پیچھے پولیس لگی ہوئی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی اس کے چہرہ کا رنگ اڑ سا گیا تھا۔ میرا تو یہ ایمان تھا کہ رمضانی۔ بدھن۔ حسینی اور الطاف کسی سے نہیں ہار سکتے' کسی سے نہیں ڈر سکتے۔ لیکن آج یہ ان چار بڑوں کو کیا ہوا جا رہا تھا۔

اتنے میں نمبردار نہ معلوم کدھر سے نکل آئے اور بدھن کو دیکھتے ہی برس پڑے ''ابے یاں بیٹھا باتیں بنا رہا ہے۔ تیری ڈیوٹی ہے آج.......اور دیکھنا ادھر آنا'' پھر بدھن اور وہ بڑے پراسرار انداز میں باتیں کرتے ہوئے گلی میں مڑ گئے۔ پھر تھوڑی دیر میں شاید نو بج گئے تھے۔ اور سپاہیوں نے لوگوں کو ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ قیوما اپنی دکان بند کرنے لگا اور ہم سب اپنے اپنے گھروں کو ہو لئے میں نے قیوما کی دکان اپنی آنکھوں سے بند ہوتی ہوئی دیکھی۔

پھر میں پاکستان چلا آیا۔ یہاں آ کر مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ ایک بوریت سی ذہن پہ طاری رہتی ہے۔ ایک روز انارکلی بازار میں نمبردار سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ بے چارے بہت روتے تھے ان کی بہت بڑی جائداد تھی' بڑا زیور اور روپیہ تھا۔ سب چھوڑ آئے۔ میرے جی میں آئی کہ ان سے قیوما کی دکان کے متعلق کچھ پوچھوں۔ مگر وہ تو اپنی باتوں میں ایسے الجھے ہوئے تھے کہ پھر میری ہمت نہیں پڑی۔ یہ انارکلی کا بازار بھی خوب ہے۔ بچھڑے ہوئے پناہ گزین یہاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی لاہور میں ہو اور اس سے کبھی نہ کبھی انارکلی میں ٹکر نہ ہو جائے۔ قیوما بھی ایک دن مجھے اسی بازار میں مل گیا تھا۔ اس بازار میں جہاں عالی شان دکانوں کی قطاریں دونوں طرف چلی گئی ہیں قیوما کتنا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی دکان رام نگر میں ہے۔ ایک روز میں

چلتا چلاتا رام نگر بھی پہنچ گیا۔ پہلے تو میں کچھ ٹپٹا سا گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ کسی اور کی تو یہ دکان نہیں ہے۔ لیکن تھڑے پہ قیوما بیٹھا تھا۔ ایک طرف بڑے قرینہ سے شیشہ کی الماری رکھی تھی۔ کچھ تھالیں بہت سلیقہ سے چنی ہوئی تھیں۔ بجلی کی روشنی سے ساری دکان جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

اس کے بعد پھر میں اس طرف کبھی نہیں گیا۔ میں غاب بھی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر قیوما نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا اور میرے سمجھ میں کچھ نہیں آتا بس کچھ ترمرے سے میری آنکھوں میں ناچنے لگتے ہیں۔

◆◆◆

خرید و حلوا بیسن کا

خرید و حلوا بیسن کا۔ اور کبھی کبھی' خرید و' کا ٹکڑا بھی گم ہو جاتا اور ''حلوا بیسن کا'' کی مدھم صدا او نگھتی رینگتی آتی اور محلے کی فضا میں ایک پراسرار قسم کا تاثر پیدا کرتی۔ تھوڑے وقفوں کے بعد یہ آواز زیادہ واضح اور زیادہ بلند ہوتی جاتی اور پھر صاف سنائی دینے لگتا!

پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا!

اور جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچتا تو غالباً وہ چند لمحوں کے لئے کھڑا ہو جاتا اور تھم تھم کر اپنے مخصوص آواز میں گانا شروع کر دیتا

پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا مسلمانوں نہ گھبراؤ شفاعت برملا ہوگی۔

پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا
طبیبوں نے کیا ہے پاس ہمارا حلوا بیسن کا

اس کے ان ادھ کٹے شعر کا ردعمل یوں تو بہت متنوع قسم کا ہوتا تھا۔ لیکن اس کا مجموعی تاثر ایک اور یکساں ہوتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اگر چہ اس دینا میں رنگ رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن ہر رنگ میں اسی ذات وحدہ لاشریک کا جلوہ ہے۔ یا اگر چہ اس جہان نا پائیدار میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب مذاہب اسی ایک منزل تک پہنچنے کے مختلف زینے ہیں۔ تو اگر چہ مختلف بچے مختلف قسم کے مظاہرے کرتے تھے۔ لیکن مقصد ان سب کا وہی ایک ہوتا تھا۔ کہ کسی طرح اماں جان سے پیسہ جھاڑ لیں اور بیسن کا حلوا خرید کر اپنی شفاعت کا سامان کر لیں۔ اور گو مختلف مائیں ان مظاہروں کی روک تھام کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتیں۔ لیکن چونکہ بال آخر غلبہ حق کا ہی ہوتا ہے اور اہنسا پر مودھرم ہے۔ اس لئے سب بچوں کی ماؤں کو زود یا بدیر رائے عامہ کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا۔ بندا کی اماں پہلے تو بندا کو بہت پچکارتی اور کہتی ''اے بندا مان بھی جا۔ بیٹا یہ حلوا تھوڑا ہی ہووے ہے' نری بورا ہے اور پیسہ پھینکنا ہے تو ویسے کہہ دے''۔ لیکن بندا گھریلو سامراج کے اس جال میں پھنستا ہوا کبھی نہیں پایا گیا۔ وہ اسی عزم بالجزم کے ساتھ اپنے مطالبہ پر ڈٹا رہتا اور بری طری ٹھنکتا بندا کی اماں باآخر آگ بگولا ہو جاتی اور اس کی کمر پہ تابڑ توڑ پانچ چھ دھب جماتی۔ پھر بندا کو ایسا محسوس ہوتا کہ اماں کوئی کالی لمبی لمبی مونچھوں والی تھانیدار ہے اور زندگی لاٹھی چارج سے عبارت ہے۔ لیکن بندا کی ماں کے تشدد اور

بندا کی قنوطیت سے قطع نظر بعد میں ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ بندا آنسو پونچھتا مسکراتا' دروازہ سے نکلتا اور شور مچانے لگتا۔ ارے پیسے کا حلوا مجھے بھی۔

چنن کی آپا زیادہ محتاط اور دوراندیش تھیں۔ چنن جہاں ٹھنکا اور انہوں نے لگے ہاتھوں لیا۔ ''دن بھر دائی توائی پھرے ہے اور گھر میں بیٹھے ہے تو یہ آفت بووے ہے'' ویسے یہ وار بہت بھرپور ہوتا تھا۔ لیکن چنن کب ہار ماننے والا تھا۔ پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا' کی صدا ہر مرتبہ اس میں ایک نئی جان پیدا کر دیتی اور پیسے کا مطالبہ زیادہ شدت اختیار کر لیتا۔ چنن کی آپا پھر دوسرے زوایئے سے حملہ آور ہوتیں۔ ''اچھا آ جانے دے اپنے باپ کو' کیسی خبر لواؤں ہوں۔ آئے کہیں کے' خود تو سڑ گشتیاں کرتے پھرتے ہیں اور اس موئے کو میرے سینے پہ مونگ دلنے کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ نہ ہوتا کہ اس کمبخت کو مدرسے میں داخل کرا دیں۔''

یوں حملے تو ہر زوایے سے کئے جاتے اور تابڑ توڑ کئے جاتے۔ لیکن آخر نصرت و کامرانی چنن کے قدم چومتی۔

مسعود کی امی کی شخصیت ذرا باوقار قسم کی تھی۔ ان کے لہجہ میں ایک سنجیدگی اور ان کی جھڑکی میں ایک ٹھہراؤ کا احساس ہوتا تھا۔ ان ماں بیٹوں کی بورژوا ذہنیت کا اندازہ تو اس ایک بات سے بھی لگا جا سکتا ہے۔ کہ مسعود اپنی ماں کو امی جی' جیسے پرتکلف اور انحطاط پسندانہ خطاب سے یاد کرتا تھا جب ساری گلی میں بیسن کے حلوے کا شور مچنے لگتا اور مختلف مکانوں کے کنواڑ کھلنے اور بند ہونے لگتے تو پھر مسعود کی حرکات و سکنات میں بھی ایک تغیر پیدا ہوتا' وہ پھونک پھونک کے قدم رکھتا اور بہت سنبھل کر ذرا رقت آمیز لہجہ میں کہتا۔ ''امی جی حلوا کھائیں گے۔'' اور امی جی کو یکایک ایسا محسوس ہوتا۔ گویا کسی نے ان کی شان میں کوئی اہانت آمیز فقرہ کہہ دیا ہے۔ وہ اپنے مخصوص پر وقار اور سنجیدہ انداز میں آنکھیں نکالتیں اور کہتیں ''ہیں اچھے بچے کہیں ایسی باتیں کیا کرتے ہیں۔ توبہ کرو۔'' مسعود اپنے گناہ پر شرمسار ہوتا۔ اور بڑے خلوص سے توبہ کرتا۔ اس کے باوجود تھال پہ جب انگنی گرتی تھی تو ہر شخص سمجھ جاتا تھا کہ مسعود آ گیا۔ لیکن یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ مسعود نے کبھی گلی میں کھڑے ہو کر پیٹ نہیں چاٹا۔ وہ تو حلوا خرید کر گھر میں سٹک جاتا تھا اگرچہ اس مختصر سی مسافت میں وہ ضبط کے باوجود بالعموم ذرا سا حلوا زبان پہ رکھ لیا کرتا تھا۔

ویسے ذہنیت بجی کی آپا جان کی بھی بورژوائی تھی۔ لیکن بجی اتنی نالائق واقع ہوئی تھی کہ اس نے اس ذہنیت کا کبھی احترام نہیں کیا۔ اس کی آپا جان نے اس بات پہ بڑے بڑے درس دیئے تھے کہ اسے محلے کے گندے اور کالے کلوٹے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہیے۔ وہ اس سلسلہ میں تلمیحات اور استعارات کا استعمال بھی بڑی فراوانی سے کرتی تھیں اور اس واقعہ کا حوالہ مخصوص طور پر دیتی تھیں کہ جوئیں ایک لڑکی کو محض اس کی گندگی کی وجہ سے گھسیٹ کر کنوئیں میں لے گئیں تھیں۔ لیکن بجی کو ہی عبرت حاصل نہ ہوئی۔ وہ

ایک کان سے سنتی دوسرے سے اڑا دیتی۔ ادھر آپا جان کی آنکھ بچی اور ادھر وہ باہر نکلی اور ان میلے کچیلے بچوں میں پہنچ کر اپنی روحانی آسودگی کا اہتمام کیا۔ بیسن کے حلوے کی آواز اس کے روح وقلب میں بھی ایک ہیجان پیدا کردیتی تھی۔ آپا جان حلوا'' اور آپا جان اپنی تعلیمات پر یوں پانی پھرتا ہوا دیکھ کر تلملا اٹھتیں۔ اور اسے ڈانٹ بتائیں کہ شریفوں کے بچے بھی کہیں ایسی بیہودہ چیزیں خریدتے ہیں۔ لیکن بجی کو تو پندونصائح سے ہمیشہ بیر رہا۔ وہ بھلا کب مانتی تھی اور اگر چہ آپا جان اس کی نالائقی پر غم وغصہ کا خوب مظاہرہ کرتیں اور نمونہ کے طور پر مسعود کے کردار کا حوالہ دے کر اسے غیرت دلانے کی کوشش کرتیں۔ لیکن بال آخر انہیں بجی کے اٹل عزم کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے تھے۔

چنوں کو دراصل اس کی دادی اماں کے لاڈ پیار نے خراب کیا تھا۔ ورنہ اس کی آپا جی کا تو یہ دعویٰ تھا کہ وہ دو دن میں اسے ٹھیک کر سکتی ہیں۔ مگر وہ آپا جی کو خاطر میں ہی کب لاتا تھا' وہ تو براہ راست دادی اماں سے رجوع کرتا تھا اور دادی اماں ایک ذرا تھوڑے سے اعتراض کے بعد اپنا بٹوہ کھولتیں اور اس کے ہاتھ پہ پیسہ رکھ دیتیں۔ لیکن چنوں بھلا ایسا بھلا مانس کا ہے کو تھا کہ یوں مان جاتا۔ وہ پیسے کا حلوا اور چٹ کر جاتا۔ تھوڑی دیر میں وہ پھر ٹھنکنے لگتا۔ دادی اماں پہلے تو ڈانٹ بتاتیں۔ لیکن جہاں وہ ذرا بسورا اور ان کا دل بھر کے آیا۔ اور پھر ان کا ہاتھ اپنے بٹوے پر چلا جاتا۔ اب آپا جی سے ضبط نہ ہوسکتا اور بال آخر وہ کہہ ڈالتیں۔ '' اے غضب خدا کا' بچے کو پیسے دے دے کے خراب کئے دیوے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی'' اور پھر آپا جی اور دادی جان میں وہ ٹھنتی کہ سارا گھر اٹھ جاتا۔ بہر حال چنوں کو پیسہ مل جاتا تھا اور وہ مزے سے دوسری دفعہ پھر حلوا خریدتا تھا۔

ان عارضی ہنگاموں اور وقتی انقلابوں سے بے نیاز وہ اپنے اسی بندھے ٹکے انداز میں آواز لگاتا رہتا۔ '' پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا' اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ کون حلوا خریدنے آتا ہے اور کون نہیں آتا بلکہ کبھی کبھی بندا کو تو اپنی ماں سے لڑنے جھگڑنے میں بہت دیر ہوجاتی تھی' لیکن وہ کبھی اس بات پر سر نہیں کھپاتا تھا کہ بندا آج حلوا لینے کیوں نہیں آیا۔ وہ نہ کسی کے آنے کا انتظار کرتا تھا اور نہ کسی کے نہ آنے پر متفکر ہوتا تھا۔ وہ تو اپنے وقت پر آتا تھا اور معینہ وقت تک ٹھہرتا تھا اور پھر چل دیتا تھا۔ اب یہ بات تو خود خریدنے والوں سے متعلق تھی کہ کون اس کی آمد سے مستفید ہوتا تھا اور کون حلوے کی نعمت سے محروم رہتا ہے۔ چنن تو بہت دور اندیشی سے کام لیتا تھا۔ ادھر اس کے کان میں اس کی آواز کی بھنک پڑی اور ادھر اس نے ٹھنکنا شروع کیا۔ چنانچہ اس کی اسی دور اندیشی کا نتیجہ ہوتا تھا کہ اکثر سب سے پہلے حلوا خریدنے والا وہی ہوتا تھا۔ بندا کو ہوش تنت وقت پہ آتا تھا۔ جب گلی کے اندر آکر وہ پورے جوش سے شعر پڑھتا تھا تب کہیں جاکر اسے خبر ہوتی تھی کہ عمل کی گھڑی آپہنچی ہے۔ پھر اس بے چارے کے ساتھ یہ آفت تھی کہ اس کی اماں

ذرا ضدی قسم کی واقع ہوئی تھی پہلے تو خوب تشدد برتتی تھی تب کہیں جا کر راہ پر آتی تھی۔ چنانچہ بندا اور بندا کی اماں مل کرا تنا وقت ضائع کر دیتے تھے کہ بندا جب پیسہ لے کر باہر نکلتا تھا تو وہ گلی کے نکڑ پر پہنچ چکا ہوتا تھا اور بے چارا بندا آوازیں دیتا اور بھاگتا دوڑتا اس کے پاس پہنچتا اور حلوا خریدتا۔ مسعود کا یہ تھا کہ دو تین آوازوں کو تو وہ خود بھی پی جاتا تھا۔ اس کے ساتھ تو کئی علتیں لگی ہوئی تھیں۔ اول تو خود اس کی ذہنیت بھی کچھ بورژوائی قسم کی تھی۔ لیکن یہ کافر دل کہاں مانتا ہے۔ ایک دو آوازوں میں وہ سارا کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا اور اب وہ یہ سوچنا شروع کرتا کہ امی سے پیسہ کیسے جھاڑا جائے۔ اس کی یہ احتیاط پسندی اور سوچ بچار اور رکھ رکھاؤ کافی وقت سے لیتا۔ پھر اس کی امی بھی ایسی نیک نہ تھیں کہ چپ چپاتے پیسہ دے دیتیں۔ ان کا کفر بھی ٹوٹتے ٹوٹتے ہی ٹوٹتا تھا۔ پھر بھی مسعود منزل کو جا ہی لیتا تھا اگرچہ پھسڈی رہتا تھا۔"

اس کی بے نیازی پہ یہاں یہ کہہ کے حملہ کی جا سکتا ہے کہ صاحب اسے اس بات کا تو یقین تھا ہی کہ اس کے گاہک آئیں گے ضرور، زور دیا بدیر گاڑی لیٹ ہو جائے وہو جائے رک نہیں سکتی۔ یہ اعتراض غلط ہے بعض بعض دفعہ کوئی غائب بھی ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر مسعود کبھی کبھی اپنے پاپا کے ساتھ کہیں باہر گیا ہوا ہوتا یا بجی بعض اوقات بیگم باغ میں اپنی خالہ جان کے گھر گئی ہوئی ہوتی تھی۔ لیکن اسے کبھی یہ خیال نہیں ستاتا تھا کہ مسعود آج کیوں نہیں آیا۔ یا بجی آج کہاں غائب ہے۔ وہ تو اپنے برا بھلا کہنے والوں کی بھی کبھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ بندا کی ماں نے کون سی کسر اٹھا رکھی تھی پہ تو وہ بندا کو مارتی پیٹتی اور پھر یکا یک اس پر برس پڑتی منا ہمارے بچوں کو بگاڑے دیوے ہے بھلا دیکھو تو سہی بورا ہی بورا ہووے ہے۔ کم بختی مارے نے لوٹنے پہ کمر باندھ رکھی ہے بندا کی ماں پہ ہی کیا موقوف تھا۔ اس کار خیر میں تو حسب استطاعت سب ہی شرکت کرتے تھے۔ پنن کی ماں بھی خوب ہی جلی کٹی سناتی تھی۔ پنن تو تنقید کا موضوع اس وقت تک رہتا تھا۔ جب تک پیسہ گانٹھ سے نہیں نکلتا تھا پنن تو پیسہ پاتے ہی پس منظر میں جا پڑتا پھر سارا نزلہ حلوے والے پر اترتا کبھی کبھی بجی کی آپا جان بھی پانچویں سواروں میں شامل ہو جاتیں تھیں اور بہت سنجیدگی سے کہتیں بھی اس پر تو بندی ہونی چاہئے۔ ہمارے بچوں کی عادتیں بگڑی جاویں ہیں غضب خدا کا یہ مرد کیسے ہیں کچھ کہتے ہی نہیں ہیں مگر وہ اللہ کا بندہ نہ ان باتوں پہ کبھی کڑھتا تھا نہ خفا ہوتا تھا اور نہ پریشان ہوتا تھا اس کے کان پہ تو کبھی جوں بھی نہیں رینگتی تھی وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ کوے کے کوسے ڈھور مرا نہیں کرتا۔ ادھر وہ تبرا پڑھتی تھیں۔ ادھر وہ اپنے اسی انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا کہتا رہتا تھا۔

وقت کا تو وہ بہت ہی پابند تھا نمازی کی نماز قضا ہو جائے اس کا آنا قضا نہ ہو۔ آندھی ہو بارش ہو اپنے اسی وقت پہ آتا تھوڑی دیر

بیٹھتا اور چلا جاتا۔ اب یہی دیکھ لو کہ پچھلے دنوں کیا کیا آفتیں نہیں آئیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو گئی لیکن اس کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔ لوگوں کا گھروں سے نکلنا بند ہو گیا تھا لوگ بس محلے کے اندر ہی چلتے پھرتے تھے۔ کوئی اگر محلہ کی گلی سے نکل کے چند قدم آگے بڑھ کر ٹاؤن ہال تک ہو آتا تھا تو بڑا فلک پہ تیر مارتا تھا۔ اور لوگ حیرت اور استعجاب کا اظہار کر کے اسے شاباشی دیتے تھے۔ کوئی من چلا اگر ٹاؤن ہال سے آگے بڑھ کر کسی اور گلی کوچے میں نکل جاتا تھا تو پھر ایسے حالوں سے لوٹتا تھا کہ محلہ کے اس کونے سے اس کونے تک ایک سنسنی پھیل جاتی تھی چہروں پہ ہوائیاں اڑنے لگتیں اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں اور دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ نصر اللہ بیچارہ ایسا کونسا دور رہ گئی تھا۔ ذرا گھنٹہ گھر سے چار قدم آگے بڑھا ہوگا کہ اسے لے لیا۔ جب وہ محلہ میں واپس آیا ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ کیسی سنسنی پھیلی ہے جس نے سنا وہ جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی اٹھا چلا آیا اور سینوں پنواڑی کی دکان پر پہنچ کے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ دکان پہ ایک مجمع لگا ہوا تھا اور چچا شیرو بیچ میں کھڑے وعظ دے رہے تھے۔ "اجی ہم نے ہزار مرتبہ کہا کہ محلے سے باہر مت نکلو مگر نہیں مانتے نہیں مانتے' لونڈے ہیں۔ اکڑ میں آ کے اینڈی بینڈی باتیں کر جاتے ہیں۔"

جعفر اب تک خون کے سے گھونٹ پیتا رہا تھا لیکن اب کے تو وہ ابل ہی پڑا۔

"چچا رہنے دو یہ باتیں۔ تم ہی ہمیں جلیل کرا رہے او نہیں تو ہم ابھی سالوں کا بیج ناس کر دیں۔"

اے تم لونڈے ہو ابھی۔ تم نہیں سمجھتے' اس بات کا موقعہ نہیں ہے۔ چچا شیرو دراصل بھانپ گئے تھے کہ جعفر کس رنگ میں بول رہا ہے۔ وہ یہ تو جانتے ہی تھے کہ جہاں ایسی ویسی بات ہوئی پھر جعفر اپنی جون میں نہیں رہتا۔

اور اسی قسم کی کشیدہ فضا میں کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گلی کے نکڑ سے وہی ایک بندھی ٹکی آواز بلند ہوتی تھی اور بلند ہوتی چلی جاتی تھی۔

مسلمانو نہ گھبراؤ شفاعت برملا ہو گی
پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا

یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیسے آجاتا تھا اس کا مکان کہاں تھا کدھر سے ہو کر وہ آتا تھا۔ اس کا تو شاید ہی کسی کو علم ہو۔ البتہ یہ ہر شخص دیکھتا تھا کہ وہ روز اسی اپنے وقت پہ آتا تھا اور مسلمانوں کی شفاعت کا سامان مہیا کرتا تھا۔

پھر ایک روز چچا شیرو نے سینوں کی دکان کے تختے پہ بیٹھتے ہوئے دھما کہ چھوڑا کہ لو بھئی دلی تو ختم ہوئی۔

"چچا کیا ہوا۔ محمد کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔"

اب اور کیا ہوتا۔سب کچھ تو ہو گیا۔سبزی منڈی‘ پہاڑ گنج‘ قرول باغ کوچہ طاہر خاں سب ختم ہو گئے۔ بڑا قتلام ہوا ہے‘ کیا پوچھو ہو۔

ممد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

جعفر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ایک ساتھ وہ بکھر ہی تو پڑا۔اب ممد کس کی باتوں میں آ رہا ہے یہ چچا ہمیشہ ڈھیل کی ہانکے ہے۔لو جی سبزی منڈی میں تو خود استاد بنے خان زیویں ہیں ان کی پالٹی تو سن ستاون ڈال دے گی مجاخ ہے۔

بھیا میں تو تمہیں اخبار کی بات بتا رہا ہوں۔ چچا شیر و نے اپنی صفائی پیش کی۔اکھبار کی دم میں نمدا۔اڑاویں ہیں سالے۔

دوسرے ممد چچا سے استفسار کر رہا تھا اور چچا کیویں ایں کہ سبزی منڈی والے مورچہ نہیں جما سکے نہیں تو دلی تو فتے تھا۔

ہاں جی چچا صبر کی تلقین فرما رہے تھے بس چوک ہی جو ہو گئی اور یہ معاملے تو ایسے ہی ہوویں ہیں ذرا سی غلطی سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے ویسے انہوں نے رن ڈال دیا لیکن کیا ہووے ہے کچھ نہیں۔

جعفر ایک ساتھ اٹھ بیٹھا لا بے سینوں بیڑی پلا۔بیڑی سلگا کے لمبے لمبے کش لیتا ہوا وہ اپنے گھر والی گلی میں مڑ گیا۔

چچا شیر و ضلعدار صاحب کی بیٹھک سے نکل کے سیدھے سینوں کی دکان کی طرف ہو لئے۔دیکھو بھئی یہ الفاظ انہوں نے کچھ اتنے ڈرامائی انداز میں کہے کہ ماحول ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا اور سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

دیکھو! چچا بھی اب سنبھل کے بیٹھ گئے۔فیصلہ یہ ہوا کہ ہر شخص جیسی جیسی جس کی حیثیت ہے اور بھئی جتنے جتنے جس کے آدمی ہیں ان کے مطابق چنے خرید ڈالے جیسے بھی ہو سکے۔راشن سے ملیں۔بلیک مارکیٹ سے ملیں مہنگے سست جیسے بھی ہوں‘ چنے خرید ڈالے اور بھنوا لے اور پھر انہیں الگ الگ تھیلیوں میں بند کر دے یعنی گھر کے ہر آدمی کی ایک تھیلیا ہو اور وہ خود اس کا ذمہ دار ہو۔

ممد کی نگاہیں چچا کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں سینوں کا منہ ادھ کھلا تھا اور اس کا ایک ہاتھ پانوں کی ڈلیا پہ رکا کا رکا رہ گیا تھا۔جعفر بیڑی کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔

”بھئی چکر یہ ہے کہ چچا نے اپنی آواز اب ڈھیلی کر دی تھی۔“ کچھ پتہ نہیں کہ کس وقت کیا ہو جائے۔

وہ اب بھی بلا ناغہ آتا تھا اور اپنے نپے تلے انداز میں آواز لگاتا تھا۔مسلمانو! نہ گھبرا و شفاعت بر ملا ہو گی۔

وہ اس ادھیڑ بن میں کبھی نہیں لگا کہ کون گھبرایا ہوا ہے اور کیوں گھبرایا ہوا ہے۔اسے یہ کرید کبھی نہیں ہوئی کہ ممد کے چہرے پر اب کیوں ہوائیاں اڑا کرتی ہیں اور چچا شیر و کیوں گھبرائے گھبرائے سے رہنے لگے ہیں اور جعفر کی زبان کو یہ ایک ساتھ تالا کیوں لگ گیا

ہے وہ بیڑی کے اتنے لمبے لمبے کش لینے کے باوجود کیوں دوان کی نہیں لیتا۔ اسے اس بات پر بھی اعتراض نہیں ہوا کہ چچا شیرو بھنے ہوئے چنوں کے نسخے کی کیوں برملا تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ تاہم وہ خود اب بھی یہی صدا لگائے جاتا تھا کہ پڑھو کلمہ محمد کا خرید وحلوا بیسن کا ہاں یہ ضرور صحیح ہے کہ اس کی تھال کے گرد جمگھٹا بہت کم ہوتا تھا اور برابر کم ہوتا چلا جار ہا تھا بندہ کی وہ چیخ و پکار اور اس کی ماں کے گالی کوسنے اب سنائی نہیں دیتے تھے۔ دروازے میں ایک بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا اور چھت کی اس کالی منڈیر پر ایک چیل بھی بیٹھی اونگھا کرتی تھی۔ مسعود کے سہ منزلہ مکان کے اس اونچے خوبصورت کوٹھے پہ بالعموم بندر بندر کا ایک افسردہ خاطر جوڑا نظر آتا تھا۔ جو جوئیں کریدنے اور ٹونگے کے کام میں مصروف رہتا تھا پن کے مکان کے دروازے پر لٹکا ہوا وہ ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ نہ معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ کنڈی میں لٹکا ہوا پیتل کا تالا دور سے چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گلی کے بہت سے مکانوں کے ٹاٹ کے پردے اسی طرح گم ہو گئے تھے اور مقفل دروازے کچھ ننگے ننگے سے دکھائی پڑتے تھے۔ اور ایک روز جب وہ ''پڑھو کلمہ محمد کا خرید وحلوہ بیسن کا۔'' کی صدا لگاتا ہوا گلی کے اندر داخل ہوا تو اس وقت بجی کے گھر کے سامنے سامان سے لدا ہوا ٹھیلا کھڑا تھا اور بجی، بجی کی آپا جان بجی کے بابا اور نہ معلوم کون کون تانگے میں سوار ہو رہے تھے۔ وہ گلی میں بیٹھا اپنے اسی پرانے انداز میں آواز لگا رہا تھا۔

مسلمانو نہ گھبراؤ شفاعت برملا ہو گی

پڑھو کلمہ محمد کا خریدو حلوا بیسن کا

تانگہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور بجی اس آواز سے دور ہوتی جا رہی تھی آج بجی ایک نیا تجربہ کر رہی تھی۔ پہلے وہ خود گلی میں ہوتی تھی اور حلوے والے کی آواز دور سے آتے آتے گلی کے اندر آن دھمکتی تھی اور پھر دور ہوتی جاتی تھی۔ دور ہوتی جاتی تھی اور گلی سے پرے نکل جاتی تھی اور وہ گلی کی گلی میں ہی رہتی تھی آج وہ آواز گلی میں آ کے جم سی گئی تھی اور وہ دور ہوتی چلی جا رہی تھی دور ہوتی چلی جا رہی تھی گلی سے پرے پہنچی جا رہی تھی۔

گلی سے جب تانگہ نکل رہا تھا تو بجی کے بابا نے بجی کی آپا جان کو یکایک ٹوکا۔ ''اجی میں نے کہا کہ وہ چنے بھی اچھی طرح سے باندھ لئے ہیں بکھر نہ جائیں۔''

اور بجی کی آپا جان نے تنک کے جواب دیا۔ ہاں ہاں باندھ لئے ہیں۔

◆◆◆

چوک

چوک کی وہ پہلی سی بات کہاں اب تو وہاں خاک اڑتی ہے اس کی زمین پر اتنی جھریاں پڑ گئی ہیں کہ صورت بھی نہیں پہچانی جاتی جدھر دیکھو کنکر پتھر پڑے دکھائی دیتے ہیں اور پھر جوتوں کے کانے کھدرے تلے۔ آم کی کالی گٹھلیاں' مرغیوں کے باسی پر نیلے پیلے اور میلے شیشے' بھینس کے گوشت کی روکھی سوکھی ہڈیاں' غرض دنیا بھر کا میل کچیل کھنچ کر چوک میں آ گیا ہے۔ بس وہ مضمون ہو رہا ہے ترازو کی اینٹ چوراہے کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ سامنے والی حویلی کی کائی آلود منڈیر پر۔ بالعموم کوئی مغموم صورت سفید چیل بیٹھی اونگھا کرتی ہے اور پھر بغیر کسی ظاہری وجہ کے آپ ہی آپ کچھ تھکے ہوئے انداز میں اڑ کر کسی نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہو جاتی ہے اکثر یہاں کوئی افسردہ خاطر بندروں کا جوڑا بھی بیٹھا نظر آتا ہے وہ بڑی خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کے روکھے پھیکے چھدرے بالوں میں سے جوئیں بین بین کر ٹونگتے رہتے ہیں اور پھر ایکا ایکی اکتا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں حویلی کی طول طویل کالی منڈیر پر وہ بڑے مضمحل انداز میں چلتے چلے جاتے ہیں اور پھر اس کے آخری کنارہ پر پہنچ کر بے دلی سے ایک چھلانگ لگاتے ہیں اور نوابن بوا کے کوٹھے پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چوک بالکل خالی پڑا رہتا ہے۔ حویلی کی دیوار' املی کا لنڈ منڈ درخت اور نوابن بوا کی دیوار کے برابر والا ٹیلہ غرض چوک کی ہر چیز سے ویرانی برستی ہے۔ ساری فضا اداس اداس رہتی ہے۔ کبھی کوئی اکا دکا محلہ والا عجلت میں قدم بڑھاتا ہوا نکلا جاتا ہے۔ اور وہاں کی کسی چیز کو نگاہ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سے خاموشی ٹوٹنے کی بجائے اور شدید ہو جاتی ہے۔

اور ایک وہ زمانہ تھا کہ چوک میں ہر وقت ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا جہاں کسی لڑکے کا گھر میں جی گھبرایا اور وہ بے سوچے سمجھے منہ اٹھائے چوک کی طرف چل دیا لڑکے گھروں میں رہتے ہی کب تھے۔ آخر چوک کس لئے تھا منارات گھر میں نہ جانے کیسے گزارتا تھا صبح ہوتے ہی وہ چوک میں آن وارد ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ اتنی سویرے اور کوئی نہیں پہنچتا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے تنہائی کا تو سوال ہی وہاں پیدا نہیں ہوتا تھا چوک خود باتیں کرتا تھا۔ منا بڑے اطمینان سے ٹیلے پہ جا بیٹھتا اور زمین پہ بے ہنگم قسم کے نقش بنانے شروع کر دیتا اور دور سے حمید اکیلا گلی میں ٹول لگاتا اور چوک کی طرف بڑھتا نظر آتا۔ پھر رفیا آتا پھر شدو آتا اور پھر لڑکوں کی لین ڈوری بندھ جاتی اور گلی ڈنڈا وہ بجتا کہ سارا محلہ اٹھ جاتا۔ کبھی شدو پتنگ اور ڈور کی چرخی لئے ہوئے نمودار ہوتا۔ وہ کسی سے بغیر کچھ کہے سنے چرخی کو زمین

میں گاڑھا اور پتنگ کو دو چار ٹھمکے دیتا اور تان لیتا بات سے بات نکلتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ چوک سے پتنگ اٹھے اور اس کا جواب نہ آئے۔ چوک سے پتنگ کا اٹھنا غضب ہو جاتا تھا۔ پھر تو مختلف سمتوں سے پتنگیں سراٹے بھرتی ہوئی اٹھنے لگتیں۔ حبیب حویلی کی اونچی چھت پر چڑھ جاتا اور دو چار ٹھمکوں میں اس کی پتنگ تارا بن جاتی۔ مشن حبیب کی چرخی محض اس امید میں تھاما کرتا تھا کہ لنگر لڑانے کے لئے اسے بعد میں تھوڑا بہت مانجھا مل جائے اور ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو پتنگ اڑانے کے لئے اسے بعد میں تھوڑا بہت مانجھا مل جائے او ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو پتنگ اڑانے والے کے بعد دوسری اہم حیثیت چرخی پکڑنے والے ہی کی ہوتی ہے۔ البتہ رفیا مسجد کی چھت پر چڑھ کر مینار سے لگ کر دوہرا ہو کر بیٹھ جاتا اور ڈور لوٹنے کی امید میں لڑتی ہوئی پتنگوں کو اضطراب کے عالم میں دیکھتا رہتا۔ اس بیچارے کو تو دو دو محاذوں پر لڑنا پڑتا تھا پتنگ باز تو خیر اس کی جان کے لیوا تھے ہی لیکن مسجد کے موذن صاحب کی آنکھوں میں بھی وہ خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ جہاں چھت پر دھمک ہوئی اور وہ بھانپ لیتے تھے کہ رفیا چھت پر آ گیا ہے۔ ساری مسجد سر پہ اٹھا لیتے تھے اور یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ سارا محلہ ان کا ساتھی ہو جاتا تھا۔ خان صاحب گھر سے فوراً نکل آئے اور چلانا شروع کر دیتے۔ اے حرام زادہ کچھ اللہ رسول کا پاس کیا کر بھلا غضب خدا کا یہ نیچے کلام مجید رکھا ہوا ہے اور یہ سالے چھت پہ دھما چوکڑی مچاتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر حمیدا بڑی بہادری دکھاتا تھا۔ وہ فوراً ٹوک دیتا خان صاحب سب کو کیوں کو ہو رفیا اوپر چڑھا ہے رفیا کو کیو۔

اور خان صاحب بغیر کسی معذرت اور صفائی کے رفیا کو برملا سنانے لگتے وہ سالا تو بے نکیل کا اونٹ ہو رہا ہے. جی اس کی ماں نے اسے بے طرح باڑا ہے۔

لیکن خان صاحب رفیا کو گالیاں دے کر اتنی آسانی سے نہیں چھوٹ جاتے تھے۔ رفیا کی ماں کو خبر ہی نہ ہو تو اور بات تھی۔ ورنہ وہ تو ان کے لئے ڈالتی تھی۔ لیکن گانے والے بھی غضب کے ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی اس کے کان میں ضرور پھونک آتا تھا اور پھر جب وہ موقع واردات پہ آ جاتی تھی تو سارا محلہ اٹھ جاتا تھا اس روز بیچارے خان صاحب نے کچھ بھی تو نہیں کہا تھا۔ بس یہی وکہہ رہے تھے کہ سالے نیچے اتر ہاتھ پیر جھاڑ دوں گا تو یہ ایسی کون سی سنگین بات تھی۔ یہ تو ان کی عادت تھی۔ لیکن عالیہ نے جا کے ان کے کان بھر دیئے اجی رفیا کی اماں اے تم یہاں بیٹھی ہو وہاں چوک میں آفت مچ ری اے۔

کیا آفت مچ ری اے۔

اے وئی خان صاحب ہیں۔ بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ رفیا کو ڈانٹ ڈپٹ رئے این بس پھر کیا تھا رفیا کی اماں نے چادر اٹھائی اور

چل کھڑی ہوئی چوک میں پہنچتے ہی اس نے خان صاحب کی مزاج پرسی شروع کردی۔ اجی میں نے کیا کہ بیوہ کو ستا کے پھل نہ پاؤ گے۔ وہ سب دیکھے ہے یہ سمجھ رکھا ہوگا کہ اس کا کوئی بولنے والا نہیں ہے۔

خان صاحب نے تنک کر کہا ذرا لونڈے کی تو خبر لے۔ کوٹھوں' کوٹھوں چھتوں چھتوں کودتا پھرے ہے۔ اسی لاڈ پیار نے تو اس کا ناس کیا ہے۔

اجی چلو رہنے دو۔ ہوگئی بہت اپنوں کے تو لچھن دیکھو وہ سنڈا حمید امنا چھٹے بجار کی طرح پھرے ہے۔ مگر امیروں کے تو غیب بھی ہنر ہیں۔ مرن تو غریبوں کی ہر ایک کوئی کیڑے ڈالنے لگے ہے۔ اور پھر تو ریل گاڑی چھٹ گئی خان صاحب بہتیرا صفائی پیش کرتے رہے لیکن وہاں سنتا کون تھا رفیا کی اماں جب چلانا شروع کر دیتی تو پھر کسی کی سن کے نہیں دیتی تھی۔

لیکن رفیا بھی ایسا احمق بھی نہیں تھا کہ روز روز پکڑا جاتا۔ وہ تو ایسے پھونک کے قدم رکھتا تھا کہ نیچے والوں کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کوئی چھت پہ ہے۔ لیکن آخر انسان ہی تو ہے چوک بھی ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا اندازہ غلط بھی نکلتا اور ڈور بجائے اس کے قریب گرنے کے چھت کے دوسرے کنارے پر گرتی اور پھر اسے مجبوراً دوڑ لگانی پڑتی تھی۔ لیکن اتنا سب مانتے تھے کہ پتنگ نہ سہی ڈور لوٹنے کے معاملے میں رفیا کا جواب نہیں۔ لیکن بے غرض اور بے لاگ ناقدوں اور مبصروں کا گروہ چوک میں ڈٹا رہتا تھا۔ انہیں نہ تو گرتی ہوئی ڈور اپنے دام میں پھانس سکتی تھی اور نہ کٹی ہوئی پتنگ کی کافرانہ جنبشیں ان کے دلوں کو لبھاتی تھیں۔ وہ بہت سکون قلب کے ساتھ اور افادی پہلو کو نظر انداز کر کے پتنگوں کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے سکتے تھے۔ اسی لئے ان کی رائیں بڑی صائب ہوتی تھیں اور بالخصوص جو چوک میں کھڑے ہو کر پتنگ اڑاتا تھا وہ ان کے بروقت تبصروں سے استفادہ بھی کرتا تھا منا کو اس سلسلہ میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس کی معلومات بہت وسیع تھیں اور بہت اپ ٹو ڈیٹ بھی۔ لگدی کی تیاری میں جو نئے نئے تجربات آئے دن کئے جاتے اور ان سے جو مانجھے تیار ہوتے ان کے متعلق اسے ایک ایک بات معلوم ہوتی چنانچہ اس نے کئی دن پہلے بتادیا تھا کہ بھیا بنیاد اب کے بڑے معرکے کا مانجھا سوت رہا ہے۔ سالے نے لگدی میں وہ وہ چیزیں ڈالی ہیں کہ یار لوگوں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی اے یہی ہوا بھی روز شام کو پتنگیں اڑتیں پٹیالہ ادھ کٹا پری گلاس غرض رنگ برنگی پتنگیں اڑتیں اور کٹ جاتیں اور بنیاد کا چاند تارا اسی طرح تنا رہتا۔ وہ تو یہ کہئے کہ مانجھے میں ہی گھسا آ گیا اور نہ بنیاد کا چاند تارا کبھی نہ کٹتا۔

یہ صحیح ہے کہ چوک میں ایسے لڑکے موجود رہتے تھے جو کھیل کے ماہر ہونے کے باوجود کھیل میں شرکت نہیں کرتے تھے اور محض نقاد کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن ہنگامی حالات ہوتے ہیں تنقید بچوں کا کھیل تھوڑا ہی ہے۔ بڑی سوجھ بوجھ اور

سوچ بچار کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام رات کو زیادہ صحیح طور پر انجام دیا جاتا تھا۔ اس وقت ٹھنڈے دل سے ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جاتا۔ مختلف افعال کا تجزیہ کیا جاتا اور پر نتائج مرتب کئے جاتے بات یہ ہے کہ رات کا وقت ذرا فرصت کا ہوتا ہے۔ رات کو نہ پتنگ اڑائی جا سکتی ہے اور نہ گلی ڈنڈا کھیلا جا سکتا ہے اور نہ کوڑیاں کھیلی جا سکتی ہیں۔ یوں رات کے وقت کے بھی اپنے الگ کھیل ہوتے ہیں لیکن بہرصورت فرصت سے باتیں کرنے کا بھی تو کوئی وقت ہونا چاہئے شدو خوب کھا پی کے اطمینان سے گھر سے نکلتا اور چوک میں پہنچتے ہی سوال کر مارتا کیوں بے منے آج کیسے رنگ رہئے۔

اجی رنگ رہئے ڈھینڈس کے بھیٔ قسم کی خدا کی اس سالے حمیدا سے تو کھیلنا ویلنا آتا نہیں اے بو بو جی ڈنڈا تو اتنی زور سے گھماوے ہے اور ٹول سالے سے لگتا نہیں۔

اچھا جی یہ تو مان لیا شدو ایک ہی وار میں اس مورچہ کو ہار کر دوسرا مورچہ سنبھالتا۔ مگر انہوں نے بے ایمانی سے جیتا بھیٔ منا تو اپنے ایمان سے کہہ دے مشن نے وہ کھپ ٹل اڑایا تھا یا نہیں۔

لیکن مسئلہ تو اتنا نازک اور دقیق ہوتا تھا کہ مخالف اور موافق نیچوں سے بیک وقت بہت سی آوازیں بلند ہوتیں اور مناسب کو چپ کراتا کراتا باؤلا بن جاتا تھا اور کبھی کبھی نظریاتی بحث تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی شدو کا یہ عقیدہ تھا کہ گلی ڈنڈے کے کھیل میں اتفاق کو بہت دخل ہے۔ منا نے اس عقیدہ کی صحت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ وہ کہتا تھا اماں باؤلے ہوئے ہو۔ اناڑی سالا تو ٹول بھی نہیں لگا سکتا۔

شدو فوراً سوال کرتا جو اس کی دانست میں بڑی مضبوط دلیل تھی۔ جی یہ کیا بات ہے کہ کبھی کبھی اچھا کھلاڑی آتے ہی لڑھک جاوے ہے۔

لیکن منا تو ہر دلیل کو چٹکیوں میں اڑا دیتا تھا فوراً کہتا اماں زعم میں تو آدمی مارا ہی جا ہے اب سالے اس اکڑ میں کھیلتے ہیں کہ بس وہی ایک تیس مار خان ہیں اندھا دھند کھیلنے میں مارے جاوے ہیں۔

اور اگر بھیا کوئی کیچ لئے تو کھلاڑی سالا اکڑ باز بھی نہیں ہوگا تو کیا ہتھیلی لگا لے اشدو بھی گرتے گرے مقابلہ کرنے کا قائل تھا۔

اجی ٹول اونچا مارے ہی کیوں؟ کھلاڑی تو دیکھ لیوے ہے کہ کدھر کیلیے والے کھڑے ہیں۔ کدھر میدان خالی ہے۔ منا کے پاس تو ہر زہر کا توڑ موجود تھا۔

لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ سارا وقت تنقیدی کام میں ہی گنوا دیا جاتا۔ تخلیقی کاموں کی بھی گاڑی رکی نہیں رہتی تھی گلی ڈنڈا اور پتنگ کے باپ کا ٹھیکہ تھوڑا ہی ہے کیسا ایسے کھیل ناپید ہوگئے تھے جو اندھیری اور چاندنی راتوں میں بے تکلف کھیلے جا سکتے ہیں اچھا اور کوئی

کھیل نہ سہی قصہ کہانی تو کہیں نہیں ماری گئی تھی اور جب کہانی کا چکر چل پڑتا تھا تو پھر رات کے بارہ ایک بجے تک پھڑ جمی رہتی تھی۔ حمید کو بے تحاشا کہانیاں یاد تھیں۔

شاہ بہرام اور سبز پری' چراغ الہ دین' گل بکاؤلی' بولتی چڑیا اور سونے کا پانی سلطانہ ڈاکو' غرض حمید کا سینہ تو گنجینہ علم سے معمور تھا لیکن سب سے زیادہ مزے سے تو وہ رستم سہراب کی کہانی سنایا کرتا تھا۔ جب کہانی ختم ہوجاتی تو فضا میں ایک المناک خاموشی پھیل جاتی۔ شدو' منا' رفیا سب کی گردنیں جھکی ہوئی ہوتیں اور زندگی کی بے ثباتی کا احساس ان کی گھورتی ہوئی نکھوں میں ایک کربناک سی کیفیت پیدا کردیتا۔ بال آخر مہر خاموشی ٹوٹتی اور شدو بڑے حسرت بھرے لہجہ میں کہتا'' کیوں جی اگر رستم آخر وقت میں بھی اپنا نام بتادیتا تو کیا مزہ رہتا۔''

حمید وہ والہانہ انداز میں جواب دیتا' اجی چلو رستم نے بھی نام نہ بتایا تھا تو میں کہتا ہوں کہ وہ سالا کیکاؤس بوٹی دے دیتا۔

مگر جی رفیا کو رسم کی امن پسندانہ پالیسی پہ اعتراض ہوتا یہ رستم کو کیا ہوگیا تھا سالے کیکاؤس کا گلا دبادیتا میں کہوں اوں کہ اگر رستم ساتھ نہ دیتا تو افراسیاب تو اس کی ایسی تیسی کردیتا۔

لیکن اگر کیکاؤس رستم کو بوٹی دے دیتا تو شدو پھر ایک حسرت بھرے اور خوابناک لہجہ میں بڑبڑاتا اور یہ ایک سوال تھا جو سب کے دلوں میں کروٹ لینے لگتا اگر کیکاؤس رستم کو بوٹی دے دیتا تو؟ تو سہراب نہ مرتا۔ اور اگر سہراب نہ مرتا تو اور تاریخ کا دھارا عجیب عجیب سمتوں میں مڑتا نظر آتا۔

پھر رفتہ رفتہ فضا کی شدت دھیمی پڑتی چلی جاتی اور حسنو' پھمن جی اور میگھ ناد کی لڑائی کی داستان سنانے لگتا جب داستان ختم ہوجاتی تو غم اور تحیر کی ملی جلی کیفیت پھر پیدا ہوجاتی اور پھر شدو اپنے حسرت بھرے اور خوابناک لہجہ میں سوال قائم کرتا کہ لیکن یار اگر میگھ ناد کا وظیفہ پورا ہوجاتا تو۔

اجی پھر ان کے اچھوں کے بس کا بھی نہیں تھا کہ میگھ ناد کو ماردیتے میں کہوں اوں کہ ان کے بڑے بھیا رام چندر بھی آکے ہتھیلی تک کا زور لگا لیتے تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ لیکن یار کیا میگھ ناد بھی ہندو تھا؟ رفیا کو تو ہمیشہ ایسی ہی سوجھتی تھی۔

اور بیٹا تم اسے مسلمان سمجھ رہے تھے؟ حسنو رفیا کی جہالت پر اظہار تحقیر کرتے ہوئے کہتا۔

لیکن یار ہندو ہندو ہو کے لڑ پڑے؟ رفیا کے وسوسے نے اب واضح شکل اختیار کرلی تھی۔

واہ بے مرغی کے ابے یزید بھی تو مسلمان تھا مگر امام حسین سے لڑا۔ حسنو تو ہاتھ کے ہاتھ ثبوت پیش کردیتا تھا۔

شدو پھر اپنے اسی حسرت بھرے اور خوابناک لہجہ میں بڑبڑانے لگتا لیکن یار اگر میگھ ناتھ کا وظیفہ پورا ہوجاتا تو؟ اور فضا پھر سنجیدہ ہوجاتی اور سب ایک گہرے سوچ میں غرق ہوجاتے اگر میگھ ناد کا وظیفہ پورا ہوجاتا تو میگھ ناد عمر بھر زندہ رہتا یعنی آج بھی زندہ ہوتا اور اگر میگھ ناد آج زندہ ہوتا تو اور تاریخ کا دھارا عجیب عجیب سمتوں میں مڑنے لگتا۔

منا ویسے یہ قصے بڑے شوق سے سنتا تھا لیکن یہ بات اسے بالکل پسند نہ تھی کہ ان میں سے کسی کی تعریف میں غلو کیا جائے پھمن جی کا پتا تو وہ بڑی جلدی کاٹ دیتا تھا ان کا کمزور پہلو تو یہ تھا کہ وہ ہندو تھے لیکن رستم کے معاملے میں اسے زیادہ لڑائی لڑنی پڑتی تھی کیونکہ اس بات سے تو منا انکار کرہی نہیں سکتا تھا کہ رستم مسلمان تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حضرت علی کے علاوہ کسی اور کی قصیدہ خوانی برداشت کرلیتا۔ حمید بے چارا رستم کی تعریف کرتے کرتے کہیں یہ کہہ گیا میاں رسم دنیا کا سب سے بڑا پہلوان ہوا ہے۔

منا جل کے کوئلہ ہی تو ہوگیا فوراً بولا اچھا جی رستم دنیا کا سب سے بڑا پہلوان ہوا ہے۔ ہاں ہاں اور کیا جناب۔ جب چلتا تھا تو گھٹنوں گھٹنوں زمین میں گڑ جاتا تھا۔ حمید نے ہاتھ کے ہاتھ دلیل بھی پکڑادی۔

اچھا جی حضرت علی سے بھی بڑا پہلوان تھا۔

وار بڑا بھاری ہوا تھا۔ پھر بھی حمید نے میدان نہیں چھوڑا۔ یار حضرت علی کی بات چھوڑ دے۔ ان کا تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

لو جی یہ ایک ہی رئی میاں ساری پہلوانی تو وہیں سے چلی ہے۔ رستم بیٹا کیا گھر سے لائے تھے۔

اور پھر بات چلتے چلتے کالے کافر تک پہنچ گئی۔ منا کہہ رہا تھا کالا کافر سالا یہ لمبا تڑنگا بالکل دیو۔ بھوک لگتی تھی تو سمندر سے مچھلی پکڑ کے سورج پہ سینک لیتا تھا۔ ذرا سی دیر میں کباب بن جاتی تھی۔ بس کھالیتا تھا۔ مگر حضرت علی نے بھی اسے ایسا پٹخا کہ بیٹا چوکڑی بھول گیا۔ پر یار وہ سالا پٹ کے بھی حضرت علی سے چارسو بیس کھیل ہی گیا۔ مزے سے قیامت تک زندہ رہے گا شدو کے مزاج میں تھی اک الحاد کی جھلک۔

لیکن منا ایسے ملحدوں کی چلنے کب دیت تھا فوراً حضرت علی نے بھی کیسی سزادی۔ ایک تلوار ماری اور کہہ دیا کہ جا یہ زخم ہر سال ہرا ہوجایا کرے گا۔ کالا کافر سارا سال مرہم پٹی کرے ہے۔ زخم اچھا ہونے لگتا ہے پر جب وہ دن آتا ہے تو پھر ویسا ہی ہرا ہوجاتا ہے۔ پر یہ کالا کافر ہوے کہاں اے حسنو تو جلا بیٹھا تھا اور موقعہ کی تاک میں تھا۔ لیکن منا بھی کچی بات کہتی ہی نہیں تھا۔ اس نے تڑسے جواب دیا۔ ریتا کاں کابل کے ایک پہاڑ میں رہوے اے جس سے جی چاہے پوچھ لو۔

اور بیچارہ حسنو ٹپٹا کر چپ ہوگیا۔

شدو تو بس اللہ کا جی تھا کچھ نہیں سمجھتا سمجھاتا تھا اسے تو خبر بھی نہ ہوئی۔ایک روز یکا یک منے نے ٹوک دیا۔ابے شدو تیرے گالوں پہ گڈے کیوں پڑے ایں۔شدو بہت سٹپٹایا منا تاڑ گیا۔باتیں ملا کے اس سے سب کچھ اگلوا لیا اور کہہ دیا کہ بیٹا مینڈو عطار کے پاس جاؤ نئیں تو خیر نئیں اے۔اور واقعی مینڈو عطار نے ایسی پڑیاں دیں کہ سات دن میں اس کا مرض خاک کی طرح اڑ گیا۔

منا بہت چلتا پرزہ تھا۔اڑتی چڑیا کو پکڑتا تھا اس میں واقعی اپج کا مادہ تھا۔جب کوئی قصہ کہانی سناتا تھا تو ایسے کلیاں پھندنے ٹانکتا کہ مزہ آجاتا تھا۔حویلی کی اس سفید میلی دیوار پہ یوں طبع آزمائی تو سب ہی فرماتے تھے جس کسی کو بھی کسی کے راز کا پتہ چل جاتا تھا وہ گھر سے بڑا سا کوئلہ لے کر چلتا اور چوک میں آکر بڑے جلی حروفوں میں مؤثر اور موزوں الفاظ میں اس کا اظہار کر دیتا اور پھر وہ بات چاروں طرف اڑ جاتی حویلی کی دیوار تو ایک اچھی خاصی تاریخ تھی سارے چیدہ اور اہم واقعات اس پر درج تھے۔لیکن منا جو گل فشانیاں کرتا تھا اس کا جواب نہیں تھا۔ایسے فقرے تراشتا تھا کہ چپک کر رہ جاتے۔اس کے فقرے بہت معنی خیز ہوتے تھے اور پھر ایسے ایسے بھیدوں کا پتہ نکال کے لاتا تھا کہ لوگ دم بخود رہ جاتے تھے۔قسمت کی بات کہ ڈپٹی صاحب کا لڑکا آ گیا۔ڈپٹی صاحب نے اسے اس کے ماموں کے پاس اسی خیال سے بھیج دیا تھا کہ یہاں کے لونڈے آوارہ ہیں۔ان کے ساتھ رہ کر بگڑ جائے گا پھر ویسے بھی یاں کوئی سکول نہیں تھا اور اسے بہر صورت تعلیم دلانی تھی تو وہ اصل میں گرمی کی چھٹیوں میں اپنے گھر آیا تھا حسنو تو ایک چھا نکلا تھا اس نے تو دو چار دن میں ہی اس سے خوب یارانہ گانٹھ لیا۔منا بھلا دیکھتا اور پی جاتا یہ کیسے ممکن تھا ایک روز صبح ہی صبح چوک میں آنے جانے والوں کی حویلی کی دیوار پر پٹی صاحب کے لڑکے اور حسنو کے تعلق کے بارے میں بڑے مؤثر اور حسین وجمیل جملے نظر پڑے اور پھر تو سارے محلہ میں ایک شور مچ گیا۔

اور پھر ڈپٹی صاحب کو یکا یک احساس ہوا کہ محلہ کے سب لڑکے آوارہ ہیں کھیل کود میں وقت ضائع کرتے ہیں اور ان کی تعلیم کا کوئی انتظام ہونا چاہئے۔بھلا ڈپٹی صاحب پہ خیال نازل ہوتا اور اس کی قدر نہ کی جاتی پھر کیا تھا چاروں طرف شور مچ گیا۔جہالت دور ہونی چاہئے سکول کھلنا چاہئے جلسے ہوئے چندے ہوئے کمیٹی بنائی گئی ماسٹر بلائے گئے اور سکول قائم ہو گیا اور پھر لڑکوں کو گھیرنے کی مہم شروع ہوئی چوک میں ادھر لڑکے نے قدم رکھا اور ادھر کسی نے پیچھے سے کان پکڑا اور کھینچتا ہوا سکول میں لے گیا۔لڑکوں میں تہلکہ مچ گیا کونوں میں چھپتے پھرتے تھے چوک میں قدم رکھتے ہوئے تو اچھے اچھوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی کبھی تو چھری کے نیچے آئے گی۔شدو تو ہمیشہ کا زاغلول تھا وہ تو چپ چپاتے پہلے ہی دن سکول پہنچ گیا۔لیکن رفیا ایسا غائب ہوا کہ پتہ ہی نہ لگا۔حمید کئی دن تک جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا لیکن اس کا باپ بھی بڑا ظالم تھا آخر کو اسے داب ہی لیا۔مارتے مارتے

کھال ادھیڑ دی کہنے لگا حرامزادہ اچٹا اچٹا پھرتا ہے اب اگر دو لفظ پڑھ لے گا تو یہ کام آئیں گے۔ ورنہ جوتیاں ہی چٹخاتا پھرے گا۔ اور رات کو حمید نے خواب دیکھا جیسے رستم اور سہراب میں خوب زور کی لڑائی ہو رہی ہے اور پھر ایکا ایکی رستم نے سہراب کو پچھاڑ کر سینہ میں خنجر بھونک دیا ہے۔ حمید سوتے سے اچھل پڑا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس کی اماں نے اس کے باپ کو جھنجھوڑا اسے دیکھو تو لونڈا ڈر گیا۔ حمید کے باپ نے اٹھ کر مید پہ آیۃ الکرسی دم کی اور پھر حمید آرام سے سو گیا۔ حسو ایک روز چپکے سے گھر سے سٹک گیا اور سٹیشن پہنچا وہ گاڑی میں بیٹھنے کو ہی تھا کہ پیچھے سے اس کی کنپٹی پہ دو کرارے سے تھپڑ پڑے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور چند لمحوں کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ میگھ ناد اپا وظیفہ ختم کرنے سے ایک دن پہلے یکا یک اٹھ بیٹھا ہے اور لچھمن جی نے اسے قتل کر ڈالا ہے۔

شروع میں تو وہ ایک چھوٹا سا مکتب تھا۔ پھر اس میں انگریزی پڑھائی جانے لگی پھر وہ ہائی سکول ہو گیا اور اب وہ انٹر کالج ہے بڑی خوبصورت پکی عمارت بن گئی ہے ہارڈی صاحب کی بڑی سی تصویر ہال میں لگی ہوئی ہے۔ ہارڈی صاحب کلکٹر تھے بڑے رعب داب کے آدمی تھے انہوں نے ہی اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ کالج کا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی رہتا ہے فرسٹ ڈویژن میں بھی ایک دو لڑکے آ ہی جاتے ہیں۔ لڑکے یہاں سے آخری امتحان پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلے جاتے ہیں یا پھر ملازم ہو جاتے ہیں بعض لڑکے تھانیدار تحصیلدار بن جاتے ہیں جنہیں تھانیداری نہیں ملتی۔ وہ بڑے دفتر میں بابو بن جاتے ہیں اس کالج کو نکلا ہوا ایک لڑکا ڈپٹی کلکٹر بھی ہے۔ ویسے بھی قصبہ کی حالت اب بہت سدھر گئی ہے۔ نئی نئی خوبصورت دکانیں کھل گئی ہیں مینڈ وعطار جیسا خود سوکھا ہوا تھا۔ ویسی ہی اس کی دکان سوکھی سڑی تھی۔ سانس کا مریض تھا اسی میں چل بسا۔ سنتے ہیں کہ بارش میں اس کی دکان کی چھت گر پڑی۔ اب وہاں ایک شاندان دکان ہے۔ اس میں شیشے کی بڑی بڑی الماری رکھی ہیں۔ ان الماریوں میں چھوٹی بڑی شیشیاں بڑے قرینہ سے چنی ہوئی نظر آتی ہیں دکان کے آگے ڈاکٹر جوشی کے نام کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر جوشی کے ہاتھ میں شفا ہے اور پوشیدہ امراض کے علاج کا تو وہ ماہر ہے۔ کالج کے لڑکوں کو اس پہ بڑا اعتقاد ہے۔ وہ اس کی دوائیاں ایسے استعمال کرتے ہیں جیسے بچہ اپنے گھر سے اڑائے ہوئے پیسہ کی مٹھائی کھاتا ہے خیر جہالت تو یہاں سے اپنا منہ کالا کر ہی گئی ہے۔ آوارگی کا بھی پتا کٹ گیا ہے۔ لڑکے صبح اٹھتے ہیں شیو کرتے ہیں کالج چلے جاتے ہیں۔ شام کو کالج کے فیلڈ میں ہاکی' کرکٹ' فٹ بال جیسے سنجیدہ اور شریفانہ کھیل کھیلتے ہیں رات کو پڑھتے ہیں یا فلاش کھیلتے ہیں یا اگر زیادہ جی گھبرایا تو کسی گمنام گلی میں ٹہلتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ چوک میں جا کر اب کوئی خاک نہیں اڑاتا۔ وہاں تو اب خاک اڑتی رہتی ہے۔ اس کی زمین پہ اتنی جھریاں پڑ گئی ہیں کہ صوت بھی نہیں پہچانی جاتی جدھر دیکھو کنکر پتھر

پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا بھر کا میل کچیل کھینچ کر چوک میں آ گیا ہے حویلی کی کائی آلود منڈیر پر بالعموم کوئی مغموم صورت سفید چیل بیٹھی اونگھا کرتی ہے اور پھر بغیر کسی ظاہری وجہ کے آپ ہی آپ کچھ تھکے ہوئے انداز میں اڑ کر کسی نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہو جاتی ہے اکثر یہاں کوئی افسردہ خاطر بندروں کا جوڑا بھی نظر آتا ہے۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کے روکھے پھیکے چھدرے بالوں میں سے جوئیں بین بین کر ٹونگتے رہتے ہیں اور پھر اکتا کر ایکا ایکی اٹھ کر ے ہوتے ہیں۔ حویلی کی طول طویل کالی منڈیر پر وہ بڑے مضمحل انداز میں چلتے چلے جاتے ہیں اور پھر اس کے آخری کنارہ پر پہنچ کر بے دلی سے چھلانگ لگاتے ہیں اور نوابن بو کے آٹے پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ نوابن بو امنا کی نانی ہیں منا نے حضرت علی اور کالے کافر کی کشتی کا قصہ انہیں سے سنا تھا۔ وہ قصہ بڑے مزے سے سنایا کرتی تھیں۔ اب تو بوڑھی پھونس ہو گئی ہیں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں ہوش وحواس کچھ خطا ہو گئے ہیں پھر بھی جب منا کی چھوٹی لونڈیا بہت پیچھے پڑتی ہے تو برے بھلے قصے سنا ہی دیتی ہیں اور جب وہ تعجب سے سوال کرتی ہے بوا جی کالا کافر سچ مچ نہیں مرے گا؟ تو وہ کہنے لگتی ہیں بیٹا کالا کافر تو قیامت کے بوریئے سمیٹے گا۔ مثا اب بھی زندہ ہے اور ہر سال اس کا زخم ہرا ہو جاوے ہے۔

◆◆◆

فجا کی آپ بیتی

میں تو میاں اس وخت گھر پہ تھا۔ اس سالی ہماری لگائی نے ہمارا لٹو پی رکھا ہے۔ اجی بات بے بات پیچھے پڑ جاوے ہے۔ میں نے اس روز اسے گیتا دی بس جی اس چکر میں بہت دیر تک تو مجھے خبر نہ ہوئی۔ بچ نے سارا گھر سر پہ اٹھالیا اور لگی منہ زوری کرنے میں اور بھن گی کڑوی بات تو اپنے باپ کی بھی نہ سنوں اور میاں عورت کو تو بس نکیل دے کے ہی رکھا اچھا۔ ذرا سی ڈھیل دے دو تو بس سر پہ ناچنے لگے ہے۔ میں نے کہا کہ دیکھ ری منہ زوری کرے گی تو مار مار کے الو بنا دوں گا۔ پر جی اس کی تو موت دھکا دے رہی تھی۔ سالی ہلہ کے جاوے میں نے پکڑا جوت' اتنے میں سینوں چچا چیختا آیا کہ بے ساری عورتوں کو حویلی میں پہنچا دو اور پھر تو ساری گلی میں ہلڑ مچ گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کوٹھے میں سے لٹھیا نکالی اور دن سے باہر۔ مجھے تو اس پہ آوے ہے کہ لو جی ہم گھر میں رہیں اور واں کام شروع ہو جائے کلمے محمد کی قسم مجھے تو پتہ تھا کہ ہو کے رہے گی روز اب بجی اور اب بجی ہو ریا تا۔ میاں کسی سے پوچھ لو میں نے تو کہہ دیا تھا کہ بھیا ہتھیلی کا زور لگا لو اب یہ رکتی نہیں اے اور پالٹی کو بھی بتا دیا تھا کہ بے لڈو اب کے سن ستاون ہو جاوے۔ پر سالی وخت کی بات ہے کہ تیار رہیں تو ہماری اور کام شروع کیا۔ مجی نے اس سالی گھر والی کے چکر سے نکلا تو اس بڑھیل جمنا نے گلی کے نکڑ پہ آن پکڑا اور لگی رول مچانے کہ اے رے بٹیاں کاں جاوے ہے۔ تجھے میرے سر کسوں میں نے کیا اری ہٹ ری ڈگریا۔ آگے بڑھوں تو کیا دیکھوں اوں کہ مجی چلا آ ریا سینہ پھلائے ہوئے۔ شیخی کے مارے مرا جاتا تھا سالا اجی وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ پالا میرے ہی ہاتھ ہے۔ مجھے دیکھ کے کیا کیوے ہے کہ بے فجا جورو کے پاس بیٹھ۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی پر جی دس وخت کیا کہتا خون کا سا گھونٹ پی کے رہ گیا۔ جی میں تو آیا کہ سالے کے جھانپڑوں اور کہوں کہ بے ماں کے خصم ذریوں سی بات پہ اترا ریا اے یاں تو عمر بھر یہی کرم کیا ہے اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیئے اور بے تجھ سے بچ۔ تھوڑا ای ایں کہ اکیلا دیکھا اور پیچھے سے چھرا مار دیا۔ یار جی تو ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ لڑے۔ جس سے ہو گئی پہلے کہہ دیا کہ سالے ذری سنبھل کے رئیو یا تو تو نئیں اے یا ہم نئیں ایں۔ یہ سیٹھ جی ہیں نا ایک دفعہ ان سے رٹا کا ہوا تھا۔ بڑے دھنا سیٹھ بنے پھرتے تھے یار جی کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ بھائی کی سنو کہ مشتریہ مرنے لگے۔ یہ منہ اور مسور کی دال مگر بھیا یہ تو سب پیسہ کا کھیل ہے۔ دمڑی میں چمڑی ملتی ہے۔ انور میاں بھول گئے۔ ان کی تو بس باہر کی ٹیپ ٹاپ ہے۔ ویسے تو کھکھل ہیں جیب میں دمڑی نہیں ہوئی مگر عشق لڑاتے ہیں۔ وہ حساب ہے کہ گھر میں نئیں دانے اماں چلی بھنانے' میں کہوں اوں کہ

جتنی چادر ہو وتنے ہی پاؤں پھیلائے۔ گانٹھ میں دام نہ ہوں تو اونچی کے پاس جاوے ہی کیوں؟ ٹکیاز میں کیا ماری گئی ہیں اور کلمے کی محمد کی قسم ٹکیاری سب سے اچھی نہ کوئی جھگڑا نہ ٹنٹا۔ کھڑا کھیل فرخ آبادی' نقد سودا لے لو اور میاں اپنا تو دھندہ ہی دوسرا ہے۔ قسم لے لو جو کبھی بیڑی کے بنڈل سے زادہ خرچا ہوا ور کلمے محمد کی قسم کچا کام کبھی کیا نئیں۔ میاں ایک دفعہ چھتری پہ قبوتر آ بیٹھے پھر پیچ کے جائیں سکتا اور دانے دنکے کا کام نہیں رکھتا۔ بس وہ حساب رکھتا ہوں کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا ہی چوکھا۔ انو میاں تو اتو کی دم فاختہ ہیں جنہیں جھاڑ بیٹھے اور نتیجہ ٹائیں ٹائیں فش۔ اماں وہ سیٹھ ہے۔ دس سے ٹکرے سکے ہیں۔ چیں بول گئے۔ میرے پاس بھاگے آئے کہ بے فجا یہ تو بنا بنایا کام بگڑ جاوے ہے۔ میں نے کیا کہ میاں دانہ ڈالو دانہ قبوتری موٹی ہے مگر میاں کے پاس دانہ ہو تو ڈالیں گڑگڑا نے نمک کھایا ہے۔ سیٹھ سالا ون کے مقابل میں آئے تاؤ آنے کی بات ہی ہے میں نے کیا کہ میاں فکرمت کرو۔ وسکا تو اب پتہ کاٹا۔ میں نے سیٹھ کے بھی کان میں بات ڈال دی۔ باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ سیٹھ جی رئیس ہو کے ایسی بات نئیں کیا کرے ہیں۔ آپس واری کا معاملہ ہے مگر وسکے مجاج کاں ملیں ہیں۔ ناک پہ مکھی نئیں بیٹھنے دے۔ مگر جی ہمیں کیا رئیس ہو گا۔ سالا اپنے گھر کا ہو گا ہم کسی سے پچھ مانگنے جاوے ہیں ستر مرتبہ غرض انکے گی تو ہمارے پاس آویں گے۔ پیارے تو میرے کپڑے اتار لو۔ مگر ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے تو سالے کی آنکھیں نکال لوں تلخ کلام تو یار جی نے کبھی باپ کا بھی نئیں سنا سیٹھ جی کس کھیت کی مولی ہیں۔ میں نے کہا کہ اچھا جی ہماری ہی بلی ہمیں سے میاؤں۔ بہت روٹھیں لگ رہی ایں استاد کو۔ اچھا بیٹا سلٹوں گا صفہ منہ پہ کنی آیا کہ سیٹھ جی ہاتھیوں سے گنے کھارے او وہ دن ہے اور آج کا دن' قسم لے لو جو پھر وسکی ڈوٹری پہ گیا ہوں۔ میاں تیسرا دن ہوا ہو گا کہ بگھی میں بیٹھا اپنی بغیا جا رہا تھا۔ میں لگا کھڑا تھا جھپٹے کا وخت جیسے ہٹ کٹ پلے سے بگھی آگے نکلی میں نے پیچھے سے چڑھ کر کے دائیں بائیں آٹھ دس ہاتھ اڑا دیئے اور یہ جا وہ جا۔ مار پیچھے پکار ہوا کرے ہے۔ بندہ کس کے ہاتھ آنے والا تھا۔ ایسا تراٹ ہوا کہ کسی کو ہوا نئیں لگی۔ پولیس کو پیچھے لگا دیا مگر اس سے کیا ہووے ہے۔ پولیس کے تو اچھے بھی ہم پہ ہاتھ نئیں ڈال سکتے۔ بھئی کلمے محمد کی قسم استاد کے گھر بیٹھ کے سارے سارے دن سکے بنائے ہیں اور داروغہ کو پتہ لیکن کبھی جو وس نے کان پھٹپھٹائے ہوں۔ ایک دفعہ ایک پٹھان داروغہ آ گیا۔ پٹھانی کے زعم میں سالے نے ہاتھ ڈال دیا۔ اماں ایسا تاما دیا کہ بس بغلیں جھانکنے لگا۔ استاد کاں چونکے ہیں۔ بولے کہ سپرڈ صاحب اعلی کے پتے پہ ڈنر پیلو۔ بڑا فوں فاں ہوا میں نے تو وسکا وہیں کام کر دیا تھا کلمے محمد کی قسم گلی کی طریوں اچ دیتا۔ مگر کیا بتاؤں۔ استاد طرح دے گئے استاد کا کہنا بھی سچا تھا کہ سالا نکل کے کاں جاوے گا دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر سالا مہینے بھر کے اندر اندر پانی مانگ گیا۔ صلح صفائی کر لی۔ وس زور سے کیا مجال ہے کہ پولیس کا کوئی آدمی چوں کر جائے۔ ایسا ویسا دفعہ آ بھی جاوے تو آنا کافی کر جاوے ہیں۔

اجی یہ پولیس کیا چیز ہے ہم نے تو دلی کی پولیس کو کنوئیں جھنکا دیئے۔ دلی کی مسجد میں ایک جھاڑ ٹنگ ریا تھا۔ کیا پوچھو ہو جی اس جھاڑ کی کلمے محمد کی ہزاروں لاکھوں تو وس میں ہیرے جواہرات لگ رہے تھے۔ تھا بھی تو اکبر باشا کے وخت کا' مجاخ ہے۔ فرنگی کا بس چلتا تو چھوڑ تھوڑا ہی دیتا سالوں کا موقعہ پڑے تو وہ تو اپنے باپ کو بھی چوٹ دے جائیں میاں تاج محل میں ایسے ایسے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ کسی نے خواب میں نہ دیکھے ہوں گے۔ سب اکھاڑ کے لے گئے یہ سالے بہادر وہادر تو خاک بھی نئیں ایں اصلی چار سو بیس ہیں شربوں میں تو یاں فرنگی ڈاکٹر آیا تھا۔ بادشاہ سلامت کا علاج اچھا کیا' میاں وہ خوش ہو گئے اور بولے کہ بول کیا مانگے ہے فرنگی تو ایک جنٹ ہووے ہے۔ بولا کہ بس جی ایک کوٹھی کی جگہ دے دو۔ پاؤں ٹکانے کو جگہ مل گئی تو پھر سالے فرنگیوں نے چار سو بیس شروع کی اور تکڑم لڑا لڑو کے سارے ملک کو ہتھیا بیٹھے۔ ان سالوں نے لال قلعہ میں جھاڑ و دے دی جمعہ محبت کا جھاڑ چھوڑ دیئے مگر جھاڑ چھت کے بیچوں بیچ ٹنگا ہوا تھا۔ انہوں نے ہتھیلی تک کا زور لگا لیا۔ لیکن وس تک ہاتھ ہی نہ پہنچ سکا۔ ہار جھک مار کے بیٹھ رئے۔ استاد کی کیا پوچھو ہو۔ ونکے سامنے فرنگی کیا بیچے ہے صف پار کر دیا اور بھیا میں اور استاد کی کیا پوچھو ہو ونکے سامنے فرنگی کیا بیچے ہے صفا پار کر دیا اور بھیا میں اور استاد راتوں رات دلی سے اڑ لئے پولیس پیچھے لگ گئی مگر میاں ہم نے بھی وئیں ایسی دلی دکھائی کہ یاد کرتے ہوں گے۔

تو بھیا یہ مجی کیا بیچ ہے۔ کیا پدی کیا پدی کا شوروا ہم نے بڑے بڑوں سے رٹا کا لیا ہے مجی سالے کو ہم کب گانٹھتے ہیں۔ اجی ہماری پالٹی کا مقابلہ کرنا آسان تھوڑا ہی ہے۔ اتا بڑا جگر چاہئے۔ انہیں میاں مجی کے استاد نصیر استاد کے منہ آنے لگے تھے۔ استاد پہلے تو ٹال ٹال گئے۔ لیکن جب مینڈکی کو بہت زکام ہوا تو استاد نے اعلان کر ڈالا کہ ہٹاؤ اب کے شبرات پر معرکہ رہے گا بس میاں شبرات پہ ہو گیا ایک ایک پانی نصیرو خان کے انار اور سینگ تو فش کر رہ جاتے تھے۔ ہمارا سینگ تیر کے موافق جاتا تھا اور خنگوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ کلمے محمد کی قسم جنے کتنوں کے تو ناک کان پھوڑ دیئے۔ صبح ہوتے ہوتے سالوں پہ سامان ختم ہو گیا۔ اینٹوں پہ اتر آئے۔ بس جی پھر تو ہم نے نہیں لے لیا۔ ذریوں سی دیر میں جھاگ چھٹے دوسرے دن استاد کا ٹھاٹ سے جلوس نکالا اور نصیرو خاں کی پالٹی کی میا مرگئی و میاں ہماری پالٹی نے تو جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ جھنڈے استاد کے پیشاب پہ چراغ جلتا تھا ونکا زمانہ نئیں ریا مگر اب بھی کسی سالے سے کمی نئیں ایں اب یہی دیکھ لو میں نے دیر میں کام شروع کیا۔ مگر کلمہ محمد کی قسم سب سے زیادہ کمائے مجی کی سورمائی یاں بھی دھری رہ گئی۔ میری طرف جو آ گیا بس بھن کے رہ گیا بس ایک بڈھے کو تو میں نے چھوڑا تھا۔ ہاتھ پیر جوڑنے لگا مجھے آ گیا ترس' سوچا کہ فجا بڈھے پہ کیا ہاتھ اٹھاوے ہے جانے دے۔ اماں وس نے آگے جا کر رول مچادی۔ میں تپ گیا پھر تو میں نے ایک کو نئیں بخشا۔ جو ہتھے

چڑھ گیا وے سے بھون ڈالا۔ ایک لونڈا بڑا خوبصورت میرا اجی اندر سے یوں کرے کہ فجا اسے مت مار بچہ ہے۔ پھر میاں میں نے سوچا کہ چھوٹا بڑا کھوتا آگے جا کے رول مچا دے گا۔ فجا پٹھے ڈھیلا مت پڑ بس جی میں نے وے سنگھوا لیا۔ مگر بھیا ایمان کی دیکھتے رہو کہ اب کوئی نکلے اب کوئی نکلے تلیا میں کانٹا ڈال دیا اور بیٹھے دعا مانگ رے ایں کہ اللہ بھیج کوئی مچھلی جب کوئی آوے ہے تو سالا بتاشے کی طریوں بیٹھ جاوے ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ آمنے سامنے کی ہوا اور ڈٹ کے ہو مگر بھیایاں تو پٹی ہو کے ہی نادیا سب سالے خصی ہیں۔ میں نے کیہا کہ یارو برابر میں لالہ کا بزار لگا ہوا ہے بگل بول دو ہو جائے ایک پانی پت کا میدان مگر کوئی مائی کا لال بول کے نئیں دیا سب کھس کھس کرنے لگے اور مجی سالے کو تو سانپ سونگھ گیا مجھ سے پوچھو تو بھیا یہ سب جو دہے بنے بھرے ہیں جیداران میں ایک بھی نئیں اے۔ نئیں تو ان سالوں کے تو توس بکھیر دیے ہوتے استاد بتا رہے تھے کہ ایک دفعہ تعزیوں پر لڑائی ہوئی تھی تو کلمہ محمد کی قسم وہ رنگ آیا تھا کہ بھائی لوگوں کے مجاج درست ہو گئے تھے۔ اجی اور تو اور رنڈیوں تک نے رنگ دکھا دیا۔ قتل کی رات کو رنڈ نئیں لالہ بشمبر کی بغیا سے کیلے کا پتا توڑ لاوے ہیں نا تو دس دفعہ لالہ نے کیا کیا کہ لٹھ بند جاٹوں کو بٹھا دیا اور کہہ دیا کیلے کا پتہ نہ ٹوٹنے پائے یار لالہ کی بغیا کا کیلا بھی کیا ہوتا تھا۔ زمین میں کھونٹا گاڑ دو، بکری باندھ لو رنڈیں اپنی منت کا چھوڑے تھیں جی۔ ٹھاٹ سے جلوس نکالا جب بغیا کے دروازے پہ پہنچیں تو جاٹ جو بڑے سورما بن کے آئے تھے آپ ہی آپ بھاگ چھٹے صبح کو کیا کیہوے ہیں کہ ہرے ہرے کپڑے پہنے اور تلواریں ہاتھوں میں لئے بہت سے گھڑ سوار آ گئے تھے میاں مجاخ ہے امام حسینوں کا معاملہ تھا مجھے تو یہ سوچ ہے کہ جی وہ بچ کے کیسے نکل گئے۔

مگر یارو اب تو معجزہ بھی ہو کے نئیں دیتا مسلمان گاجر مولی کی طرف کٹ گیا اور اللہ میاں کچھ بھی تو نئیں بولا۔ وس کے بھید وہی جانے پٹنہ میں تو مسلمانوں کا پٹڑا ہو گیا امرتسر میں سکھوں کی چڑھ بنی اور دلی سات مرتبہ لٹی تھی۔ اب کے ہندوؤں اور سکھوں نے وے اوجڑ کر دیا کلمے محمد کی قسم جب میں سنوں ہوں تو میرا خون کھولنے لگے ہے مگر جی دھوکے سے مارنا بہادری تھوڑا ہی ہے ہم تو جب جانتے کہ برابر کی ٹکر ہوتی اور جیت جاتے بھیا یہ تو فوج کے بل پہ کودتے ہیں نئیں تو وس سے پہلے امرتسر میں ونہوں نے کیا تیر چلایا میاں امرتسر کی کیا پوچھو ہو ایک دفعہ استاد گئے تھے۔ وہ بتا رئے تھے کہ ہاں بھئی امرتسر میں بڑا بڑا اجی وار پڑا ہے۔ مگر یار لاہور یئے گھسیل نکلے نام بڑا اور درشن تھوڑے وہ تو بھول گئے تھے۔ مگر امرتسریوں نے چوڑیں بھیجیں تو پھر وہیں ذری شرم آئی۔ اماں مجھ سے پوچھو ہو تو بس مورچہ تو گوڑگانوہ میں لگا تھا۔ ہیوائی تو بڑے بکٹ ہووے ہیں وںہوں نے جو گڑھ کی خبر سنی تو بس بھنا گئے جمنا کا پانی پیا اور اعلان کر دیا کہ اب گنگا کا پانی پی کے ہی دم لیں گے۔ جاٹ مقابلے پر آ ڈٹے۔ خوب بجی جاٹوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ دور دور سے تو

جاٹ ونکی مدد کو پہنچا تھا۔ اسوڑے والے تو ہاتھی پہ چڑھ کے گئے تھے مگر کیا تیر چلایا۔ میں نے ہر جاٹ سے پوچھا کہ پہلوان تمہاری ہاتھی کی دم کہاں گئی۔ سالا جھینپ کے رہ گیا اجی وس پٹیالہ والے نے فوج بھیج دی نئیں تو جاٹوں کی تو ونہوں نے بھلی بکھیر دی تھی حیدر آباد والا بڑا بودا نکلا۔ اگر وس وخت اپنی ایک پلٹن بھیج دیتا تو پٹیالہ والے کی تو ایسی کی تیسی ہو جاتی اور اگر کہیں کابل چڑھ آتا تو سارے ہندوستان کو تیس نیس کر ڈالتا۔ میاں ہندو تو بس ہندوستان میں ہی دکھائی پڑے ہیں اور مسلمان تو ساری دنیا میں ہیں سالوں نے ترکی کو نہ دیکھا ہے۔ وہ بول پڑتا تو ونکی ساری تیزی ترکی نکال دیتا مگر بھیا اب تو مسلمانوں ایکار یا ہی نئیں۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہو ریا اے۔ آپس میں ہی لڑتے ہیں محبت مروت خاک نئیں ری۔ اگر ایکا ہوا تو دنیا کا تختہ پلٹ دیتے مگر فرعون بے سامان بنے پھرتے ہیں۔ وسی کی تو سزا بھگت رئے ایں کلمے کی قسم مسلمانوں پہ عذاب پڑ ریا اے اللہ پاک بھی سب کچھ دیکھتا ہے۔ اجی اگر میری جھوٹ سمجھو تو مولبی صاحب سے پوچھ لو۔ مولبی صاحب علم دریاؤ ہیں۔ کلام مجید کے مانے تو ایسے بتاوے ہیں کہ بس دنگ رہ جاؤ تو وہ کہہ رہے تھے کہ یو ساری آفتیں یوں آ رئی ہیں کہ مسلمانوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ اجی تم نماز کی کہو ہو کلمے محمد کی قسم لوگوں کا کلمہ تک ٹھیک نئیں اے۔ یہ نئے نئے لونڈے جنٹلمین بنے پھرتے ہیں چار حرف انگریزی کے پڑھ کے سمجھ لیوے ہیں کہ ساتوں علم پڑھ لئے اور اگر کلام مجید کی ایک آیت کا مطلب پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگیں میں کہوں اوں کہ سارے علم تو کلام پاک میں ہیں جس نے کلام پاک نہ پڑا وہ خاک کا عالم ہے۔ ایک آیتۃ الکرسی سے ستر بلائیں دور رہتی ہیں۔ مگر آیتۃ الکرسی یاد کسے ہے اور لونڈیوں نے تو سب کو ہی مات دے رکھی ہے جسے دیکھو کالج میں پڑ رئی ہے۔ پریاں بنی بنی پھرے ہیں۔ طاق سامنہ کھلا ہوا سر سے دوپٹہ غائب اجی یہ طور اشرافوں کے ہیں؟ ہم نے تو اشرافوں کی عورتوں کو کبھی گھر سے قدم بھی نکالتے نہیں دیکھا اب انو میاں کی اماں جی کو ہی دیکھ لو کبھی جو کسی کے سامنے آئی ہوں۔ بوڑھی پھوس ہو گئیں مگر سقہ تک نے کبھی ونکا آنچل نئیں دیکھا۔ بیٹھک میں ہر وقت پھڑ جمی ریوے ہے لیکن کیا مجال؟ جو کوئی گھر کی کسی عورت کی آواز بھی سن جائے۔

اجی اب مسلمانی تو نام کی رہ گئی ہے۔ سب لکیر پیٹتے ہیں دین ایمان کسی کا بھی سلامت نئیں اے جو مسلمان بنے بنے پھرے ہیں ون کی مسلمانی بھی بس مطلب کی ہے اب مختیار صاب ہیں بڑا اسلام مسلمان کرے ہیں مگر میں پوچھوں ہوں کہ وہ کون سا مسلمانی کا کام کررئے ایں کبھی جماعت میں شریک ہوئے؟ کبھی پیسہ دھیلا اللہ کے نام کا دیا؟ کون سی محبت بنوا دی کون سا مدرسہ کھلوا دیا؟ ہم نے تو کبھی ونہیں محبت میں دو پیسے کے کڑوے تیل کا چراغ بھی نہ جلاتے دیکھا۔ اجی اس بات کو چھوڑ وہ سود کھاوے ہیں میں پوچھوں ہوں کہ سود کھانا کون سے شرع شریف نے بتایا ہے اور پھر مسلمانوں سے بیچارے اللہ دیے کا تو ونہوں نے کباڑا کر دیا۔ وس بیچارے

نے بیٹی کے بیاہ میں ون سے دوسو روپے لئے تھے۔ اسی چکر میں وسکا مکان قرق کرالیا اور وہ بوڑھیا جمنا روتی پھرے ہے دس کی اتی بڑی زمین ہے کبھی ونہوں نے وسے پھوٹی کوڑی محصول کی نئیں دی کرفیو لگا تھا تو ونکے گھر میں آٹے کی بوئیں کی بوریں بھری رکھی تھیں لوگ مرتے گئے مگر وس بندہ خدا نے کسی کو ایک چٹکی آٹا نئیں دیا۔ ویسے کیا مسلمانی کا دم بھرے ہیں میٹنگیں کررے ایں۔ تقریریں کررئیے ایں مگر ونکے کسی لونڈے نے رات کو پہرہ دے کے نئیں دیا۔ ایک دفعہ رات کو محلہ میں شور مچ گیا سب ڈنڈے بڑنگے لے کے آگئے مگر مختار صاب کوٹھے سے نیچے نئیں اترے ایک دفعہ ون سے بندوق مانگی تو ہزار بہانے پکڑا دیئے بڑے اصیل ہیں۔ ہتھے پر چڑھ جائے تو اپنے باپ کو بھی چوٹ دے جائیں میں تو اس کی مختیار کی صورت سے جلوں ہوں کلمے محمد کی قسم وسے دیکھ کے میرا خون کھولنے لگے ہے۔ وس نے بڑا غریبوں کا خون پیا ہے۔ جی میں آوے ہے کہ ایک روز وس کا خون پی لوں اور میں کسی کا دبیل تو ہوں نئیں جو چونک جاؤں میں نے جب سیٹھ کی کرکری کردی تو اس کی کیا ہستی ہے۔ اللہ دیا تو ملی کا گو ہے میں بڑا بکٹ ہوں۔ مختیار کا مجھ جیسے سے پالا نہ پڑا ہوگا بیٹا کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا مگر کیا کروں یہ خیال آجاوے ہے کہ ہے تو مسلمان ہی اجی مگر کا ہے کا مسلمان ہے؟ ہم نے تو وس میں اور سیٹھ میں کوئی فرق دیکھا نئیں۔ غریبوں کا خون چوسنے میں دونوں مرد ہیں۔ اجی اب مسلمانی وسلمانی کہیں نا ہے سب ڈھکوسلا ہے مسلمانی تو بھیا اب دھوکے کی ٹٹی بن کے رہ گئی ہے۔ میں تو یہ کیوں اوں کہ قیامت قریب ہے مولبی صاب نے قیامت کی یہی نشانیاں بتائی تھیں۔ فرمارئے تھے کہ جب قیامت قریب ہوگی تو گھر سے عورتیں نکل پڑیں گی آسمان سے آگ برسے گی اور مغرب میں مرغی کے انڈے کا نشان دکھائی پڑے گا۔ تو میاں دیکھ لو کہ عورتیں تو گھر سے نکل ہی پڑی ہیں۔ آسمان سے آگ اب اور کیا برسے گی۔ ملک کے ملک تباہ ہوگئے اور میاں یہ ولایت مغرب ہی میں تو ہے اس کا جہار جب آسمان پہ اڑے ہے تو عین مین مرغی کا انڈہ سا لگے ہے۔ بس جی اب دنیا ختم ہے۔ جینے کا دھرم تو اب رہا ہی نئیں دنیا کی رونق تو ختم ہوگئی۔ اب نہ لڑنے میں مزہ ہے نہ ملنے میں۔ یہ سالی کیا لڑائی ہوئی مجھے تو خاک مزہ نہیں آیا لڑائیں تو بس استاد کے زمانہ میں ہولیں۔ اب تو سالے کرموں کو روئے ہیں یہ تو بھیا ہیجڑوں کی لڑائی تھی۔ میاں برابر کی ہو تو لڑنے میں بھی مزہ آوے ہے۔ مگر اب بہادری تو رئی نئیں بہادری کا نام رہ گیا ہے۔ ہر کوئی جودھا بنا پھرے ہے اور دل دیکھو تو قبوتری کا سا سب سالے چار سو بیسی ہیں۔ دل کا کوئی صاف نئیں۔ جب دین ایمان نہیں رہے گا تو یہی ہوگا۔ یہ سالی دنیا پاپ کا گھڑا ہے۔ اجی بس اب یہ پاپ کا گھڑا منھو امنہ بھر گیا ہے۔ کوئی دم میں غٹ سے ڈوب ہی جائے گا سب مرے کے رہ جائیں گے۔ زمین' آسمان' پہاڑ' سمندر یہ سب سالے ایسے اڑ جائیں گے جیسے دھنا روئی دھن دیوے ہے۔ میاں جنہوں نے مسلمانوں کا خون چوسا ہے۔ ونکا حشر بڑا برا ہوگا اور اس سالے مختار کی بخشش تو بالکل نئیں

ہوگی۔ وسکا تو یزید کے ساتھ حشر ہوگا۔ کھرا دوزخی ہے۔ قیامت کی قیامت سے قیامت رئی میں تو اسے قیامت سے پہلے ہی چت کرنے کو پھروں ہوں۔ میرے اڑنگے پر آجائے اگر بیٹا کو قیامت ے پہلے مرغی کا انڈہ نہ دکھا دیا تو فجا اپنے باپ سے نئیں اے اجی میری کیا کوئی پونچ اکھاڑ لے گا۔ میں خود جینے سے بیزار بیٹھا ہوں۔ جینے میں اب مزہ کیا ریا۔ اس سالی دنیا کو تو چڑی ہوئی امبیا سمجھو یار لوگ چوس کے پھینک گئے۔ گٹھلی چھلکا ہمارے لئے رہ گیا۔ ماں میں تو یہ سوچ ریا ہوں کہ صور جب پھنکے گا ایک دفعہ میں کیوں نہ بگل بول دوں اول مرنا آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ یہ سالی روز کی گھس گھس تو ختم ہو۔ ایک دفعہ تو بہار آہی جائے گی۔ اس سالے جینے میں بہت پاپڑ بیلنے پڑے مرنے میں تو ذریوں مزہ آجائے بس جی اپن نے تو دل پہ دھرلی ہے کہ لگے رگڑا مٹے جھگڑا۔

◆◆◆

اجودھیا

وہ آج بھی چلتے چلاتے دونی کی ریوڑیاں خرید لایا تھا کتے کی دم اور انسان کی عادت یہ دو چیزیں تو ایسی ہیں جیسی ہوگئیں بدلتی بدلاتی نہیں ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ لیکن اسے تو اتنے پیسے پھونکنے کے بعد بھی عقل نہیں آئی تھی کسی خوانچہ والے کے پاس اجلی ریوڑیاں نظر آئیں اور وہ پھسلا لیکن جب خرید کر وہ ایک ریوڑھی منہ میں ڈالتا تھا تو اس کی صورت اس خان کی سی بن جاتی تھی۔ جس نے صابونی کے چکر میں صابون خرید لیا تھا لیکن اگر ایمان کی پوچھوں تو اس بیچارے کی بھی بڑی مشکل تھی وہ نہ تو شراب پیتا تھا اور سگریٹ۔ وہ تو ریوڑیوں سے ہی اک گونہ بے خودی پیدا کرنے کا عادی تھا کفر جس چیز میں بھی ہو وہ پھر ایسی منہ کو لگتی ہے کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لیتی اب یہ دیکھو کہ اسے گھر چھوڑے ہوئے ایک ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا ہوگا لیکن وہی مرغے کی ایک ٹانگ والی بات تھی وہ جب انارکلی بازار سے گزرتا تھا تو ادبدا کر چار چھ پیسہ کی ریوڑیاں خرید لاتا تھا اور ہر مرتبہ انہیں منہ میں ڈالنے پر اس پر وہی اک قسم کی کیفیت گزرتی تھی آج وہ خوانچہ میں بچھے ہوئے رنگین پتنگیاں کاغذوں پہ لٹو ہو گیا تھا۔ ان کی ترک بھڑک دیکھ کر اسے یہ امید بندھ گئی کہ ریوڑیاں کچھ اچھی ہونگی۔ لیکن جب اس نے ایک ریوڑی منہ میں ڈالی تو حسب معمولی وہی تمبا کو میں بسا ہوا سا گڑ منہ میں گھل گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ شاید اگر خوانچہ والا اس وقت سامنے ہوتا تو وہ انہیں اس کے منہ پر دے مارتا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اس وقت تو وہ لحاف میں لپٹا لپٹایا پڑا تھا اور پھر کسی نہ کسی بہانہ منہ چلنا بھی ضروری تھا۔ یوں بھی وہ صابون خریدنے والے نان کے اصول کا قائل تھا بلکہ شاید اس سے چار قدم آگے ہی تھا کیونکہ پٹھان نے تو ایک دفعہ ہی اپنا پیسہ کھایا تھا لیکن وہ بار بار ریوڑی خریدتا تھا اور اپنا پیسہ کھاتا تھا اس نے ہاتھ روکا تو نہیں۔ ہاں یہ سوچ کر اس کا خون ضرور کھولتا رہا کہ یہاں والوں کو ریوڑیاں بنانی بھی نہیں آتیں۔ اس نے سوچا یار یہ تو کچھ نہ ہوا۔ رمیش سے ریوڑیوں کی فرمائش کرنی چاہئے۔ اس میں شرم کی بات بھی نہیں ہے۔ تحفے تحائف کا سلسلہ چلتا ہی ہے آموں کی ہی مثال لے لو۔ لوگ منہ سے کہہ کہہ کر آموں کی فصل میں آموں کے تحفے قریب و دور سے منگاتے ہیں۔ چچا غالب کی یہی عادت تھی دنیا بھر سے فرمائش کرتے تھے۔ برسات میں جس کو خط لکھا آموں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور خود ریوڑیوں کے سلسلے میں یہی چکر چلتا ہے۔ رامچندی ریوڑی والے کے زیادہ گاہک تو تحفہ تحائف بھیجنے ہی ہوتے تھے تو اگر رمیش بھی اسے تھوڑی سی ریوڑیاں تحفتاً بھیج دے گا تو ایسا غضب تو نہ ہوجائے گا لیکن پھر اس کی قومی غیرت نے یکا یک جوش مارا نہیں جی

گولی مارو ریش سوچے گا کہ سالا بڑا آگیا تھا پاکستان۔ روٹی کپڑا الگ رہا۔ ریوڑی کے دانے تک کو محتاج ہو گیا۔ ابھی دیکھا کیا ہے ابھی تو معلوم پڑے گی۔ بیٹا کی طبیعت ہری ہو جائے گی اور اس خیال نے اسے جواز پیدا کرنے کی کوشش پہ مائل کر دیا۔ آخر ریوڑی بنانا ایسے کون سے کمال کی بات ہے یوں کہو کہ یا لوگوں نے ہاتھ پیر ڈال رکھے تھے اور ہندو سکھ حلوائیوں سے ساری چیزیں خریدتے تھے کیا اگر وہ دل پہ دھر لیں تو اچھی ریوڑیاں نہیں بنا سکتے اور پھر وہاں بھی اور سب جگہ کون سی کمال کی ریوڑیاں بنتی تھیں بس ایک میرٹھ ہی تو تھا۔ رہا لکھنو اور علی گڑھ کا معاملہ تو وہاں والوں نے خواہ مخواہ جھک مارا ہے لکھنو تو ہر بات میں نفاست کی ٹانگ توڑتا ہے اور اس میں مارا جاتا ہے۔ ہر چیز اپنی مقدار میں اچھی ہوتی ہے جسے حسن کہتے ہیں وہ نام ہی تناسب کا ہے اور یہ علی گڑھ کے حلوائی تو خواہ مخواہ منہ چڑاتے تھے ریوڑیاں تھوڑا ہی بناتے تھے مکھیاں مارتے تھے مختصر یہ کہ ریوڑیاں اگر کہیں بنتی تھیں تو وہ میرٹھ میں بنتی تھیں۔ باقی سب جھوٹا جھگڑا تھا۔

رمچندی ریوڑی والے کی دکان اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرنے لگی۔ جاڑوں میں کیسی رونق رہتی تھی۔ اس پر شیشے کے صاف صاف مرتبانوں میں ریوڑیاں اور مختلف قسم کی گزک رکھی رہتی تھی۔ پیتل کی دھلی منجھی تھالوں میں حلوہ سوہن اور تل بھگا رکھا رہتا تھا کبھی کبھی تو اس دکان پہ اتنی بھیڑ ہوتی کہ کھڑے کھڑے پاؤں دکھ جاتے اور باری نہیں آتی تھی حق یہ ہے کہ بی۔ اے کا امتحان تو اس نے رمچندی کی ریوڑیوں کے بل پر ہی دیا تھا۔ ورنہ ایک ڈیڑھ بجے رات تک کتابوں سے مغز پچی کرنا کس کے بس کا تھا۔ ایک دفعہ تو وہ کوئی بارہ بجے رات کو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی دکان پہ جا پہنچا۔ اس کی دکان پہ بالکل دن چھپل رہا تھا اور وہ ڈھائی من کی لاش رمچندی گاہکوں کے بھیڑ بھڑ کے کو نبٹا کر اب ذرا اطمینان کا سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ رمچندی کی دکان کی ساری ریوڑیاں باندھ لاتا اور پاکستان کی ہر ریوڑی کی دکان کو رمچندی ریوڑی والے کی دکان بنا دیتا۔ لیکن اسے بھلا کون ایسا کرنے دیتا اور پھر اس وقت اتنی فرصت اسے تھی ہی کہاں۔ وہاں چلتے ہوئے کیا جیسے اس نے گیارہ آنے کے سنترے اور سات آنے کے کیلے خریدے تھے۔ بارہ چودہ آنے کی وہ ریوڑیاں نہ خرید سکتا تھا شاید اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان سے پاکستان آنے کے معنے کیا ہوتے ہیں اس نے معنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ وہ تو بس دھرا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اپنے ایک بستر ے اور صندوق کے ساتھ سٹیشن پر دہرا تھا سٹیشن اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ پھر گیا وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپنے میں مذہبی کتابوں میں عرصہ محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا۔ یہ وہی سٹیشن تھا جہاں عام طور پر سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ بھلا کنٹونمنٹ سٹیشن کا کون رخ کرتا تھا۔ کوئی مارا پڑا مسافر پہنچ گیا۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اڑی لیکن اس روز وہاں آدمی پڑا پڑا تھا ایسے ایسے وضعدار

آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے۔ جن کا تصور ان کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا وہ آج اپنی ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رسہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں یکا یک ایک دن اپنی ڈاڑھی منڈا ڈالے ہر طرف سامان کے اڑنگ لگے ہوئے تھے اور سٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پر یہ کیفیت تھی کہ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ ایک دفعہ کوتوال کو بھی غصہ آ ہی گیا اور اس نے ٹکٹ گھر پر کھڑے ہو کر ہنٹر برسا دیا ایک کھدر پوش ڈاڑھی والے صاحب نے مجمع لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے ''مسلمانوں کا یہ براحشر مسلم لیگ نے کرایا۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں یہ لوگ جنت سمجھ کر جا رہے ہیں وہ جہنم ہے۔'' اور جسے جہنم سمجھ کر چھوڑ رہے ہیں وہ جنت ہے۔ کسی صاحب نے پیچھے سے فقرہ کسا اور توفیق نے اسے یکا یک پیچھے سے آ کر جھنجھوڑا تھا کہ ''ابے مسخرے باتیں بنا رہا ہے ذرا سامان پہ لگ۔'' اور وہ ہڑبڑا کر مگر خیالات کی زنجیر الجھ کر ٹوٹ گئی اور اسے یاد آیا کہ وہ ریوڑیاں کھانا تو بھول ہی گیا ہے۔

اس نے جیب میں سے چھ سات ریوڑیاں ایک ساتھ نکال لیں اور چبانے لگا۔ ریوڑی کا گڑ بار بار دانتوں کے درمیان چپک کر رہ جاتا وہ سوچنے لگا جب چم چیچڑ قسم کی ریوڑیاں ہیں۔ یہ سالے ریگل کے سامنے والے خوانچہ والے تو آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ انارکلی میں کم از کم اس سے بہتر تو ریوڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ انارکلی بھی خوب بازار ہے۔ بچھڑے ہوؤں کے ملنے کی جگہ ایک زمانہ میں تو اچھا خاصا مہاجروں کے ملنے کا اڈہ بن گئی تھی۔ رشید صاحب اسے ایک روز یہیں تو ملے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے تھے۔ ارے بھئی کب آئے ہیں کہتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا کہ چلے آئے۔ ابھی یہاں کچھ نہ سہی مگر میں کہتا ہوں صاحب کہ ایمان تو محفوظ رہے گا اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا شاید رشید صاحب طنز کر رہے تھے لیکن اس نے تو ان کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا ان کے تیوروں سے تو بڑا اخلاص ٹپک رہا تھا تاہم اگر یہ طنز نہیں تھا تو کیا تھا وہ تو اپنا ایمان بچا لایا اگرچہ اچانک ایک کتابی قنوطیت کی رو آئی اور اسے بہا کر ایک اور ہی طرف لے گئی یہ ایمان کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں محض ایک واہمہ ہے۔ بے ایمانی بھی تو ایک طرح سے ایمان ہی ہوتی ہے نہ ٹوٹنے والا کفر سب سے زیادہ پختہ ایمان ہوتا ہے اور پھر ایمان کا ہجرت سے کیا ناطہ۔ یہ ہجرت کا لفظ اس کے حلق سے اتر نہ سکا پھر وہ کون ہے۔ مہاجر' مفرور' بھگوڑا' پناہ گزین' اسے ہلکا پھلکا سیدھا سچا لفظ بھگوڑا۔ بہت پسند آیا ویسے بھی وہ ٹھیٹھ اردو لفظ تھا۔ لیکن ان کا متر اوقات میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا ذہن ایک اور لفظ کی طرف جا لپکا۔ بن باس اس لفظ میں اسے بڑی مٹھاس معلوم ہوئی تو وہ بن باسی ہے اپنے وقت کا راجہ رامچندر۔ وہ پھر اپنے فعل کو آدرشی جامہ پہنا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ جرمن اپنے وطن کو باپ تصور کرتے ہیں لیکن اس نے ان کی تقلید کرنا مناسب نہ سمجھی۔ ماں بھی تو آخر بن باس دے سکتی ہے۔ راجہ دسرتھ نے سوتیلی ماں کے کہنے سے راجہ رامچندر

جی کو بن باس دے دیا۔ اس کی ماں نے اسے اس کے سوتیلے بھائی کے بہکانے میں آ کر بن باس دے دیا یہ بھائی کا رشتہ بھی خوب ہے۔ اس نے ہمیشہ فساد پیدا کیا۔ اسے برادران یوسف کا قصہ یاد آ گیا اور پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ سارا فساد ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کا پیدا کیا ہوا ہے آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ بھائی نے بھائی کا ہمیشہ یہی حشر کیا ہابیل قابیل کے وقت سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن رامچندر جی کے بھی تو بھائی تھے۔ اور یہاں آ کر اس کا ذہن دوسرے رستہ پر پڑ لیا۔ رام لیلا کے بہت سے مناظر اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اجودھیا رامچندر جی کے جانے کے بعد کیسا ویران ہو گیا تھا ساری رونق تو راجہ رام چندر کے دم کی تھی۔ راجہ سرتھ خود انہیں کو دیکھ دیکھ کر کے جیتے تھے۔ رامچندر جی بن کو سدھارے۔ راجہ سرتھ دینا سے چل بسے۔ وہ تو من کا سانپ تھے من پہ ناند ڈھک دو۔ سانپ اندھا ہو جائے گا اور ناند سے ٹکریں مار مار کے مرجائے گا۔ وسرتھ جی اکیلے ڈھنڈار میں ٹکریں مار مار کے مر گئے۔ اس کے اجودھیا میں بھی اب خاک اڑتی ہو گی اور من کا سانپ ناند سے ٹکرا ٹکرا کے دم توڑ چکا ہو گا۔ من بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ جب رات کو من کا سانپ نکلتا ہے تو سارے جنگل میں اجالا ہو جاتا ہے من اگر کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو اس کے بس وارے نیارے ہیں۔ وہ سالا بھی بہت گپ ہانکا کرتا تھا کہ اسے من مل گیا تھا لیکن ایک چوٹا اسے چوٹ دے گیا۔ وہ بھی بے پر کی اڑاتا تھا۔ ویسے ایک بات ہے۔ آدمی خوب تھا اس کی دکان پہ ہر وقت چوکڑی جمی رہتی تھی اور وہ آلہ اور دل کا بھی موقعہ رکھتا تھا۔ دوپہر ہوتی اور وہ جھلنگا چارپائی دکان کے نیچے نالی کے قریب بچھ گئی۔ گھنٹوں گزر جاتے تھے اور آلہا اور دل چلتی رہتی تھی اس کے دل میں اک گدگدی سی اٹھی کہ وہ آلہا اودل کے شعر گنگنائے۔ وہ شعر یاد کرنے لگا لیکن اس کے حافظہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کسی مصرعہ کا کوئی ٹکڑا یاد آتا تھا اور اٹک کے رہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ایک مصرعہ یاد آیا وہ بھی ادھا پونا۔

آلہا اودل بڑے لڑیا

اس نے بہت زور مارا لیکن دوسرا مصرعہ یاد ہی نہیں آیا اسے پسینہ آ گیا۔ وہ یادوں کے سہارے جیون بتانا چاہتا تھا اور یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جا رہی ہے اور اب تھوڑی دیر میں وہ خلا میں گر پڑے گا وہ بہت دیر تک چپکا پڑا رہا۔ اس چپکے پن میں ایک مبہم خوف کی بھی جھلک تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن پھر اپنے کام سے لگ گیا۔ اسے خیال آیا کہ آلہا اودل کے پڑھے جانے کا زمانہ برسات کا ہوا کرتا تھا اور برسات کے خیال کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں ایک سریلی آواز گونجنے لگی۔ باغ میں پپہا بولا میں جانوں میرا بھیا بولا پپہا کو وہ ہمیشہ پپیا کہتی تھی اور خود بھی وہ کچھ پپیا سی ہی تھی۔ جب دیکھو پٹ پٹ کرتی رہتی تھی۔ اس روز جب وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ پپیا بجانے میں مصروف تھی تو اس نے

پیچھے سے آ کے چپت جما دی تھی۔ کیوں ری تو نے میرا پپیا کیوں توڑا ہے وہ ام کی گٹھلیاں کتنی محنت اور خلوص سے جمع کرتا تھا ان پہ راکھ ڈالتا تھا۔ انہیں روز پانی دیتا تھا۔ پھر ان میں سرخ زرد کلے پھوٹتے تھے۔ پھر ہلکے عنابی پتوں کی ایک شاداب چھتری سی بن جاتی تھی۔ کس کی مجال تھی کہ اس کے پلیوں کو ہاتھ لگا جائے لیکن وہ خسیس بھی نہیں تھا۔ ترنگ میں جب وہ آ جاتا تھا تو ایک چھوڑ کئی کئی پپئے وہ لوگوں کو بخش ڈالتا تھا۔ جب بادل گھر گھر کر آ رہے ہوتے تھے اور ننھی ننھی بوندھیاں پڑنے لگتی تھیں تو پپئے کی پپ پپ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ برسات بھی خوب موسم ہوتا ہے۔ چیزوں کا رنگ وروپ ہی بدل جاتا ہے۔ پھر روز سر پہ ایک تیوہار کھڑا رہتا ہے آج چھڑیوں کا میلہ ہے کل رکھشا بندھن ہے پرسوں جنم اشمٹی ہے اور ہر تیوہار پہ بارش ہونی ضروری' جنم اشمٹی پہ اگر مینہ نہ برسا کرتا تو کنہیا جی کے پوتڑے کیسے دھلا کرتے اور رکھشا بندھن پہ مینہ پڑے اور پھر پڑے۔ خواہ ایک بوند ہی پڑے۔ رکشا بندھن کے ساتھ ساتھ اسے پھر رمیش کا خیال آ گیا۔ رکھشا بندھن پہ وہ رمیشن کو ضرور ڈیڑھ دو روپیہ سے کٹوا دیا کرتا تھا۔ رمیش ذات کا برہمن سہی لیکن دل کا بنیا تھا۔ اس لئے بات اٹھنی سے شروع کرتا تھا لیکن جب وہ ایک دفعہ حلوائی کی دکان پہ آ جاتا تھا تو پھر وہ رمیش کو ایسے اڑنگے پہ لا کے مارتا تھا کہ ڈیڑھ دو روپے پہ بھی مشکل سے ہی چھوڑتا تھا جب وہ اس کے گھر پہنچتا تھا تو بملا اس کی کلائی میں راکھی باندھ دیا کرتی تھی۔ ویسے راکھی ہوتی ہی کیا ہے چند ریشمی دھاگے اور سنہری پنیاں۔ لیکن جب وہ کلائی پہ بندھ جاتی ہے تو پھر دیکھو آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ اس نے رکھشا بندھن والے دن کا تصور کیا۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا رمیشن کے گھر پہنچا تھا۔ بملا نے اس کے راکھی باندھی تھی وہ اور رمیش شام تک سجے ہوئے بازاروں اور گلیوں کے چکر کاٹتے رہے اور مختلف دکانوں پہ رک رک کے مٹھائی بھی اڑائی تھی لیکن وہ اس دن کا کوئی چمکتا ہوا تصور قائم نہ کر سکا اسے وہ دن خواب آلود دھندلکوں میں لپٹا ہوا سا دکھائی دیا۔ اسے ایسے محسوس ہوا گویا وہ کوئی شیریں خواب ہے۔ جسے وہ ہزار کوشش کے باوجود بھولتا چلا جا رہا ہے یا پچھلے جنم کے کسی واقعہ کا ایک خیال ہے۔ جس کی خوشبو اڑتی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سہارا لے دے کے چند ایک یادیں رہ گئیں تھیں اور یہ یادیں چپ چاپ ایک ایک کر کے کھسکتی جا رہی تھیں شاید اسے واضح طور پر یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیوں کا مزہ کیسا ہوتا ہے بس ایک خیال سا تھا اس خیال کے بل پر وہ اظہار خیال کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے قصبہ کے حلوائی تو علی گڑھ سکول کے حلقہ اثر میں تھے۔ وہی علی گڑھ کے طرز کی چھوٹی چھوٹی گول گول بھر بھری ریوڑیاں بناتے تھے۔ لیکن وہ خود میرٹھ کی ریوڑیوں کا رسیا تھا اور اس سکول کے سب سے بڑے نمائندے رمچندی کی ریوڑیوں پر جان دیتا تھا۔ ان ریوڑیوں سے رمیش کی نہ معلوم کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ رمیش' ریوڑیاں لیکن اب یہ تثلیث بکھر گئی تھی۔ اس سے رمیش اور ریوڑیاں دونوں چھٹ گئے تھے۔ رمیش کے پاس ریوڑیاں رہ گئی تھیں اور وہ الگ ہو گیا

تھا اب وہ ریوڑیاں نہیں کھاتا' اپنا پیسہ کھاتا ہے۔ رمیش اب ریوڑیاں کٹکٹا نہیں ہوگا' زہر مار کرتا ہوگا۔ رمیش کے ساتھ مل کر بھی وہ کیسی عجیب عجیب حرکتیں کرڈالتا تھا۔ ویسے تو ہمیشہ اس کی رونی صورت بنی رہتی تھی۔ لیکن جب رمیش ایک دو دن کی چھٹی لے کر دلی سے آجاتا تھا تو وہ بالکل کینچلی بدل لیتا تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ اس روز ریوڑیاں کٹکٹا ہوا ماتا محلہ میں سے گزر رہا تھا۔ ایک لڑکی چوبارے میں کھڑی انہیں یونہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ریوڑی اسے دکھا کر گپ سے منہ میں ڈال لی تھی۔ اس کے ٹپٹا کر بھاگ جانے کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی اور وہ بے ساختہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑا۔ پھر یہ ہنسی رفتہ رفتہ ایک اداسی کیفیت میں بدل گئی کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ وہ سوچنے لگا اب وہ دن کاہے کو لوٹ کر آئیں گے۔ یہ زمانہ بھی عجیب بے ہنگم قسم کی چیز ہے اس کا سر پیر تو ہے ہی نہیں۔ اسے تو بس بے پیندی کا لوٹا سمجھو کسی طرف بھی لڑھک جاتا ہے اور ساتھ میں ساری چیزوں کو بھی لڑھکا لے جاتا ہے۔ گزری ہوئی باتیں خواب وخیال بن کر رہ جاتی ہیں۔

رمیش کی باتیں سوچتے سوچتے اسے محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی بادشاہ کی بھولی بسری کہانی ہے جو اس نے بچپن میں نانی اماں سے سنی تھی اور جسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس بادشاہ کے دو شہزادے تھے ایک دفعہ وہ ایک شکار کو گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا جارہا ہے بڑے شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ دوسرا شہزادہ بھی پیچھے چلا۔ لیکن وہ کسی اور راستہ پر نکل گیا۔ وہ دونوں راستہ بھول گئے۔ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے یہاں آکر اس کے حافظہ نے دم دے دیا اسے اتنا تو یاد تھا کہ بہت سی مصیبتوں کے بعد وہ بال آخر آپس میں مل جاتے ہیں اور اندھے راجہ کی آنکھوں میں نور آجاتا ہے لیکن کب ملے کیسے ملے' یہ اسے بالکل یاد نہیں آیا۔ اسے کہانی کا آغاز یاد تھا۔ انجام وہ بھول گیا تھا انجام یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ آج کل کہانیوں کا انجام بھی نرالا ہوتا ہے۔ اب شہزادے بچھڑ جاتے ہیں ملتے نہیں پہلے بادشاہ روتے روتے اندھے ہوجایا کرتے تھے۔ اور پھر ان کے لال مل جایا کرتے تھے اور ان کی آنکھوں میں نور آجایا کرتا تھا۔ اب شہزادے گھر سے نکل جاتے ہیں اور بادشاہ روتے روتے اندھے ہوجاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں اور شہزادے نہیں پلٹتے اور محل کھنڈر بن جاتے ہیں اور کھنڈروں میں جن بھوت رہنے لگتے ہیں اور پھر اسے رام چندر جی کی کہانی یاد آگئی۔ اس کا ذہن عجیب اینڈی بینڈی پگڈنڈیوں پہ بھٹکنے لگا اسے ایسے لگا گویا اجودھیا پھر ویران ہوگیا ہے۔ رام چندر جی بن کو نکل گئے ہیں اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں اور سارے اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے لیکن اس کے خیال نے پلٹی بدلی۔ اجودھیا کے دن چودہ برس بعد پھرے تھے اور اب اس کا تصور دھندلا سا گیا۔ گویا ایک لاری تیزی سے اس کے پاس سے گزر گئی اور وہ گرد میں اس بری طرح اٹ گیا کہ سوائے ایک مٹیالے

پن کے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کا ہاتھ پھر ریوڑیوں کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن جنبش نہ کرسکا۔ اس کا ہاتھ ایک جگہ رکھے رکھے سو گیا تھا۔ اس نے ایک تھوڑی سی کوشش سے اسے جنبش دی اور ایک میٹھی میٹھی گدگدی پیدا کردینے والی سرسراہٹ اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ کچھ تھک سا گیا تھا اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے اکڑا لیا اور پھر کروٹ لیتے ہوئے ایک لمبی سی جمائی لی اس کی زندگی میں اس نے سوچا اب وہ ہی کیا گیا ہے۔ یادیں اور جماہیاں' یادیں دھندلی پڑتی جارہی ہیں اور جماہیاں طویل ہوتی جارہی ہیں۔ اس کے دل میں وہ جو ایک بوند لہو کی نظر آتی تھی وہ سکڑ رہی تھی' معدوم ہو رہی تھی اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کا مستقبل ایک طویل بے کیف جماہی ہے۔ اس احساس سے سہم کر اس نے پھر ایک بار اپنے حافظہ کو جھنجھوڑا کئی تصویریں ایک ساتھ ابھریں اور آپس میں متصادم ہو کر گڈمڈ ہوگئیں۔ اس نے کسی شام کا تصور کرنا چاہا جو اس نے رمیش کے ساتھ گزاری ہو لیکن یہ شامیں ایک تو تھیں بہت کثیر تعداد میں پھر پتنگ کے مانجھے کی طرح آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے مانجھے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تو بے طرح الجھا ہوا تھا اور تو اور خود رمیش کے چہرے کے خطوط اب اس کے تصور میں ایسے بہت واضح نہیں رہے تھے۔ اسے یہ وسوسہ ستانے لگا کہ رمیش اب اس سے چپ چاپ دور ہوتا چلا جارہا ہے پہلے وہ کتنی جلدی جلدی خط بھیجتا تھا اور بعض دفعہ تو خطوں کی وہ ریل گاڑی چھوڑ دیتا تھا لیکن اب تو اس کے پاس کوئی ڈیڑھ دو مہینہ سے اس کا خط نہیں آیا آیا تھا شروع میں وہ اپنے خطوں میں اس پر کس بری طرح برستا تھا لیکن اب تو اس کا لہجہ بہت دھیما پڑ گیا تھا۔ یہ دھیما پن کسی دوری کی علامت تو نہیں ہے۔ اس کے دل میں ایک سوال دھیرے سے ابھرا اور مبہم سی کپکپی پیدا کر کے ڈوب گیا۔ اسے رمیش کا وہ پاکستان آنے پر پہلا خط یاد آ گیا۔ جس میں اس نے اسے بڑی جلی کٹی سنائی تھیں۔ اسے بھی خاصا جوش آ گیا تھا اور تیر کا جواب تلوار سے دینے کی نیت سے اس نے قلم اٹھا کر بے تکان لکھنا شروع کر دیا تھا مگر چار چھ طنزیہ فقرے لکھ کے اس کا قلم رک گیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کے طعن آمیز فقرے وہ اور نہیں لکھ سکتا تھا مانگ تانگ کر وہ ایک وقت کی ہنڈیا کا تو انتظام کر ہی سکتا تھا لیکن وہ کسی بات پر جم کب سکتا تھا وہ تو نرا تھالی کا بینگن تھا لیکن وہ جوازِ پیش کرنے میں تو بہت مرد تھا۔ آدمی ہے ہی تھالی کا بینگن ہوگی زمین گول' ویسے وہ دکھائی تو تھالی کی طرح چپٹی پڑ پڑتی ہے۔ کوئی ایک بات پکڑ لینا اور اسے عقیدہ بنا لینا تو ذہنی جمود کی نشانی ہے یہ تو گویا زمین کی گردش سے کشتم کشتا کرنا ہے لیکن ایک مخالف لہر ابھری۔ یہ بات بھی تو ایک عقیدہ ہی ہوئی۔ اس کا ذہن مناظرہ کا میدان بنتا جارہا تھا۔ لیکن وہ رسہ تڑا کر بھاگ چھٹا۔ اس نے ہٹ دھرمی کے انداز میں سوچا کہ مارو گولی جو لوگ لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے قسم کی چیز بننا چاہتے ہیں شوق سے بنیں لٹھ چھوڑ قطب مینار بنیں اس کی بلا سے۔ وہ تو تھالی کا بینگن ہے۔

عقیدہ والوں کو عقیدہ کی دم مبارک وہ تو لنڈورا ہی بھلا ہے اور اس بحث سے چھٹکارا پا کے اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا آخر بات کہاں سے چلی تھی اور یہ تھالی کا بینگن بیچ میں کیسے لڑھک آیا سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ بات پھر رمیش سے متعلق تھی لیکن رمیش کا تھالی کے بینگن سے کیا واسطہ یہ تو وہ بات ہوئی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ رمیش، تھالی کا بینگن آخر کیا ربط ہے ان دونوں باتوں میں۔ اسے یکایک خیال آیا کہ وہ خود جو تھالی کا بینگن ہے اس لئے رمیش کا تھالی کے بینگن سے تعلق ہوا اور اب اسے یاد آیا کہ وہ درحقیقت اسی تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رمیش سے اس کا کیا تعلق رہ گیا ہے۔ رمیش اسے مہینوں خط کے پرزے سے بھی یاد نہیں کرتا اور خود اسے اب رمیش کی صورت بھی شاید اچھی طرح یاد نہیں رہی ہے غلط۔ اس نے فتویٰ لگایا اور کوئی ہوتا تو خیر مان بھی لیا جاتا لیکن رمیش کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ آخر کون سی بات ہے جو اسے یاد نہیں ہے اور اپنی بات کی پچ میں وہ ایک دفعہ پھر حافظہ سے کشتم کشتا کرنے لگا۔ دھند میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے آئیں اور گم ہوگئیں اس کی کیفیت تو کچھ ایسی ہو رہی تھی گویا بل میں ادھ گھسے سانپ کی دم پکڑے اور وہ دم پھسل کر سٹاک سے غائب ہو جائے۔ اس پر پھر افسردگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

آخر یادوں کا کیا اعتبار وقت پڑنے پر تو ایسی سکتی ہیں کہ دور دور تک ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ یادیں تو چار دن کی چاندنی ہوتی ہیں پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا پھر اپنی روح کی اس بھائیں بھائیں کرتی ہوئی اندھیری رات ہی سے بالا پڑتا ہے رام چندر جی بن کو سدھارتے ہیں اور اجودھیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی روح تو اجودھیا ہوتی ہے اس کی رونق تو دوسرے کے ہاتھ ہے اور یہ دوسرے وفا نہیں کرتے۔ اجودھیا کی تقریب سے اسے رام لیلا کے دن یاد آ گئے۔ اس کا ذہن اس دسہرے کی طرف منتقل ہو گیا جو اس نے آخری بار رمیش کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ دسہرہ بھی اس کے ذہن میں پوری تصویر ابھر آئی تھی عجب رنگ کا آیا تھا اس کا طور ہی بے طور تھا ساری فضا میں ایک وحشت ایک ڈراؤنے پن کی کیفیت بسی ہوئی تھی ویسے آدمی اس مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھے بازار سے لے کر میلہ تک تانگوں، بگھیوں اور چھکڑوں کی لین ڈوری لگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی کچھیوں کے اس اونچے دروازے میں گھستے ہوئے اس نے واضح طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ پچھلے سال والا میلہ نہیں ہے۔ اس میں سے کوئی چیز گم ہوگئی ہے میلہ کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورے میلے میں وہ اکیلا اس کھوئی ہوئی چیز کی نمائندگی کر رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے رمیش یکایک چونک پڑا تھا۔ بے کشن کال گیا اور پھر وہ اسے شامیانہ کے نیچے کھڑا کر کے ڈھونڈتا ڈھونڈتا نہ معلوم کدھر نکل گیا تھا۔ وہ وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ دور کچھیوں کے تین دیو قامت ڈھانچے کھڑے تھے۔ گردن تک کالے سیاہ کانوں میں بڑے بڑے پنی میں منڈھے ہوئے

بالے۔ کالی لمبی لمبی مونچھیں، ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال۔ یہ وہی رنگی قسم کے ڈھانچے تھے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا اور جنہیں دیکھ کر اس کا تخیل ماضی کی پراسرار فضا میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر بہک نکلتا تھا لیکن آج خوف کی ایک مبہم ننھی منی لہر اس کے دل میں سرسرا رہی تھی۔ بھیڑ اتنی تھی کہ کئی چکر کاٹنے کے باوجود انہیں وہ زرد پوش زرد روز ندہ شبیہیں نظر نہ آئیں جوان بھیانک ڈھانچوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو اپنی حدوں سے آگے نہیں بڑھنے دیتیں اور یہاں کھڑے کھڑے جب اسے کشن کے کھو جانے کا خیال آیا تو وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ بھیڑ اسے بھی نگل جائے تو اور اتنے میں رمیش آ گیا تھا۔ چل بھئی کشن تو ملا نہیں وہ خاموش سر نیوڑہائے گھر پہنچے تھے۔ لیکن گھر پہ کشن موجود تھا اور اپنے تاؤ کی گود میں بیٹھا پوچھ رہا تھا تاؤ رے راجہ نے شہزادے کی آنکھوں سے رومال چھوایا نا تو اس میں کیا تھا جو راجہ کو ٹیپنے لگا اور اب وہ خود سوچ رہا تھا کہ اس رومال میں کیا تھا۔ یہ سوال اس کے خیالات کی زنجیر میں کچھ اس آڑے ترچھے طریقہ سے اٹکا کہ وہ زنجیر ہی ٹوٹ گئی وہ سوچتے سوچتے اب تقریباً بالکل تھک گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے پھر سو گیا تھا اور جب اس نے ہاتھ کو جنبش دی تو پھر وہی ننھی منی لہریں اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگیں۔ اس کا دماغ خالی ہو گیا تھا شاید سوچنے کیلئے فی الحال کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ایک خیال دھندلی پرچھائیں کی طرح اب بھی اس کے ذہن میں منڈلائے جا رہا تھا گویا رام چندر جی بن کو چلے گئے ہیں اجودھیا میں اندھیا پڑا ہے اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں۔

◆◆◆

رہ گیا شوق منزل مقصود

اماں جی کو پان کی طلب بری طرح ستا رہی تھی لیکن مشن تھا کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ چار قدم پہ جی پنواڑی کی دکان تھی۔ لیکن مشن تو جہاں جاتا تھا وہیں کا ہو رہتا اور پان لینے تو وہ ایسا جاتا کہ جم جاتا تھا۔ لیکن دامن تو اماں جی کا بھی بالکل پاک نہیں تھا۔ تالی تو دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے۔ بلکہ مشن کا تو نام بدنام ہو گیا تھا اور نہ اماں جی بھی بلا کی بنی ہوئی تھیں۔ اکٹھے پان منگانے کی تو وہ قائل ہی نہ تھیں۔ پہلے ان کا پیسہ چلتا تھا مہنگائی کا اثر اتنا ہوا کہ پیسے سے ادھنا ہو گیا تھا۔ جب پان کی آخری کتر لگا کر وہ ڈاڑھ میں دبا لیتی تھیں۔ اس وقت انہیں سرت آتی تھی اور پھر وہ بٹوے سے اودھنا نکال مشن کو دوڑاتی تھیں کہ جا رے مشن جی کے دو پیسے کے پان لے آ اور دیکھیو اس جوان مرے سے کہیو کہ کرارے کرارے دے اور سنیو مرمت جا بیٹھیو جا کے۔ لیکن جئی کی دکان ایسی گری پڑی تو تھی نہیں کہ لپکے ہوئے جاؤ پیسہ پھینکو اور پان لے کے الٹے پاؤں پھر آؤ وہاں تو رنگ ہی وہ جما رہتا تھا کہ لوگ رستہ چلتے چلتے رک جاتے اور چلتے چلاتے ثواب کما لے جاتے تھے دکان کے پتھر سے نکلتے ہوئے لکڑی کے تختہ پر ہرے ہرے پان اور ان پر بھیگا ہوا قند کا کپڑا۔ شام کے وقت اس سرخ کپڑے پر بیلے کے پھولوں کے پتلے پتلے گجرے پڑے ہوئے عجب بہار دکھاتے تھے۔ اس تختے کے گرد ایک جنگلا سا تھا جس میں سوڈے کی سرخ زرد بوتلیں چنی رکھی رہتیں اور دکان کے اندر رکھی ہوئی لکڑی کی الماری کا تو خیر ذکر ہی نہیں۔ اس رنگ برنگی لاتعداد بوتلیں نہ معلوم کب سے جوں کی توں چنی رکھی تھیں اور جن کے بارے میں مشن کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا کہ ان میں بڑے مزے دار شربت بھرے رکھے ہیں۔ اسی الماری پر اور شاید اتنی ہی مدت سے شیخ مبارک علی اینڈ سنز' تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور کا وہ کلینڈر ٹنگا ہوا تھا جس کے بیچ میں مدینہ منورہ کی تصویر تھی اور اس کے چاروں کونوں پر کمال اتاترک' رضا شاہ پہلوی' مولانا محمد علی جوہر اور مولانا سرسید احمد خان کی تصویریں بنی ہوئی تھیں لیکن اس کے برابر اصغر علی محمد علی تاجران چوک لکھنؤ کا تاج محل کی تصویر والا کیلنڈر شاید تین چار سال سے زیادہ پرانا نہیں تھا۔ اس کے ذرا پیچھے شیشہ چڑھی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ جس طغرے میں

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمد مرسل نہ رہے کون رہے گا

والا شعر لکھا ہوا تھا۔ اس پر کافی گرد جم گئی تھی۔ براق کی تصویر کی براق مکھیوں کی نذر ہو گئی تھی مکھیوں نے سخاوت کے دریا مادھوری کی تصویر پر بھی بہائے تھے جو اس طغرے اور براق کی تصویر کے درمیان لٹک رہی تھی۔ لیکن مادھوری کے چہرے کی لطافت تو اس کثافت میں بھی جلوہ پیدا کر رہی تھی۔ کم از کم مشن کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مکھیوں کی چنی ہوئی یہ قطار در قطار بندیاں مادھوری کی تصویر سے الگ کوئی چیز ہیں۔ دکان کے سامنے سے رواداری میں گزرتے ہوئے بھی وہ مادھوری کے چہرے پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا تھا اور یوں براق کی یہ تصویر بھی اسے کچھ کم متاثر نہ کرتی تھی۔ کسا ہوا شفاف جسم پریوں کا سا چہرہ۔ سفید براق شہپر اور پھر اس کا چہرہ اور شہپر کچھ انداز سے اوپر اٹھے ہوئے تھے کہ خواہ مخواہ یہ شبہ گزرتا کہ وہ ایک مرتبہ پھر آسمانوں کی سمت پرواز کرنے والا ہے لیکن سامنے والی دیوار پر جو تصویر لگی ہوئی تھی وہ اس اہتمام سے سب سے الگ نمایاں طور سے آویزاں کی گئی تھی کہ اس پر نظر پڑتے ہی اس کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو جاتا تھا۔ دلی کی جامع مسجد' سفید دلدل پر فوجی لباس میں قائداعظم اور ان کے ہاتھ میں وہ ہلالی پرچم جس کا سبز پھریرا جامع مسجد کے میناروں کو مس کر رہا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جس نے اس تصویر کے متعلق لوگوں کو اتنا سمجھایا تھا کہ کم از کم مشن تو اس کے تمام اسرار و رموز' اس کے تاریخی پس منظر اس کی سیاسی اور معلیٰ معنویت اور اس کے نازک فنکارانہ گوشوں کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ جبی کا دعویٰ تھا کہ وہ یہ تصویر دلی کی جمعہ مسجد والے بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ وہ دلی کب گیا تھا اور کیسے گیا تھا تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے اس واقعہ کوئی عینی گواہ نہ سہی لیکن یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کی تردید بھی نہیں کر سکتا تھا پھر جب وہ دلی کے چشم دید حالات بیان کرتا تھا تو کون کافر یہ شبہ کر سکتا تھا کہ اس نے دلی نہیں دیکھی ہے مشن کی اماں جی تو دلی کا تحفہ بلی ہی بتاتی تھی لیکن جبی نے وہاں بہت کچھ دیکھا تھا۔ لال قلعہ' جمعہ مسجد' اولیا صاحب کی درگاہ' قطب صاحب کی لاٹھ' لاٹ صاحب کا دفتر جبی تو اس فراٹے سے نام لیتا چلا جاتا تھا کہ لوگ اس کا منہ تکتے رہ جاتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں یہ جتانا کبھی نہیں بھولتا تھا کہ بھئی قسم کلام مجید کی میں قطب صاحب کی لاٹھ پہ چڑھا ہوا۔ میاں وہ اتنی اونچی ہے کہ نیچے سے کھڑے ہو کر سکی چوٹی کو دیکھو تو تمہاری ٹوپی گر پڑے۔ مشن کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا حسنو پہ سکتہ سا طاری ہو جاتا۔ شفیا کی گردن جاتی اور جبی کو یوں محسوس ہوتا کہ قطب مینار کی سب سے اونچی منزل پہ وہ کھڑا ہے اور شفیا حسنو' مشن سب بالشتے بنے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور ان کی ٹوپیاں نیچے گر گئی ہیں۔ قطب مینار سب سے اونچا مینار سہی لیکن سب سے آخری بات نہیں ہوتی تھی جبی ایس نیک کب تھا کہ یار لوگوں کو اتنا سستا بخش دیتا۔ اگر کوئی اور نہیں پوچھتا تھا تو وہ خود گھما پھرا کر جامع مسجد کے میناروں پہ اپنے چڑھنے کا ذکر نکال لیتا تھا اور بتاتا تھا کہ جمعہ مجست کے میناروں سے ساری دلی دکھائی دیوے ہے۔ لیکن یہاں آ کر حسنو کی منطقی کی حس بیدار ہو جاتی اور وہ سوال کھڑا کر دیتا۔ اچھا جبی بیٹا ذرا بتا کہ جمعہ مجست

زیادہ سے اونچی ہے یا قطب صاحب کی لاٹھ اور اس سوال پہ جی تپ جاتا تھا۔ وہ موازنہ اور ترجیح کے اصولوں میں اعتقاد رکھتا نہیں تھا لیکن حسنو کی ہر بات میں فی چھانٹنے کی عادت تھی۔ جی ہر ایک سے اپنا لوہا منوانے پہ تلا رہتا تھا۔ لیکن حسنو ایک ہیکڑ باز تھا وہ کب کسی کو گانٹھتا تھا۔ اس نے بس دلی ہی نہیں دیکھی تھی ویسے وہ کسی بات میں گ ہٹیا نہیں تھا۔ پٹھا ہر وقت چھیلا بنا پھرتا اور شام کو تو ایسا بن ٹھن کے جی کی دکان پہ بیٹھتا تھا۔ کہ بس وہ ہی وہ نظر آتا تھا۔ چکن کا رنگین پھولوں والا کرتا' بھڑ کدار پٹیالہ تہمد' گلے میں پھولوں کا گجرا' چنبیلی کے تیل میں بسے ہوئے لمبے لمبے بال پھر ماشاء اللہ اس کا جسم۔ کون سا فعل ایسا تھا۔ جو اس نے نہیں کیا تھا۔ لیکن کاٹھی بنی ہوئی تھی۔ فقرہ باز بلا کا تھا۔ یہ تو ممکن کبھی ہوا ہی نہیں کہ جی کی دکان کے سامنے سے کوئی خوبصورت لونڈا گزر جائے اور وہ فقرہ نہ کسے لیکن ایک بات ہے دل کا حاتم تھا جس پہ دل آ گیا۔ اس کے وارے نیارے کروا دیئے نواز نے تو اس کے طفیل میں وہ ٹھاٹ کئے ہیں کہ یاد کرے گا۔ نورا نے اگر حسنو کو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی اجازت دے رکھی تھی تو حسنو نے بھی اس پہ پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ آگرہ میں جب دنگل ہوا تھا تو محض نور کا دل رکھنے کے لئے اس نے اتنے دور دراز کا سفر اختیار کیا تھا یہ صحیح ہے کہ اس نے ٹکٹ نہیں خریدے تھے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جب ٹونڈے کے سٹیشن پہ وہ پکڑے گئے تھے تو اس نے دس روپیہ کا نوٹ ٹی ٹی کی ناک پہ دے مارا تھا۔ آگرہ کے دنگل میں وہ گو نگے پہلوان کی کشتی سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس نتیجہ پہ پہنچا تھا کہ گونگا جب اتنا تگڑا ہے تو گاماں تو بس رستم ہوگا۔ اسی دنگل کے طفیل اس نے تاج محل بھی دیکھ لیا تھا اور اس لئے جی جب کبھی لال قلعہ کی خوبصورتی کی تعریف کرتا تو حسنو ادبدا کے ٹوک دیتا تھا کہ بے کیا لال قلعہ تاج بی بی کے روضہ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ آخر جی آدمی تھا کہ کہاں تک برداشت کرتا۔ ایک روز بگھڑ پڑا کہ پیارے تو نے دیکھا کیا ہے ایک آگرہ دیکھ آیا تو بڑا فلک پہ تیر مارا۔ اے آگرہ میں تو پاگل بند ہوویں ہیں۔

حسنو کب بند تھا فوراً بولا کہ سالے تو کون سا ولایت ہو کر آیا۔ ایک دلی دیکھ آیا تو پجامے سے نکلا اور پڑے ہے اور میں تو کھوں اوں کہ دلی میں بھی تو نے بھاڑ ہی جھونکا۔ اب ہم جاتے تو کچھ کر کے آتے۔

نکھلو! جی اپنی سیاحت پہ پانی پھرتا ہوا دیکھ کر بلبلا اٹھا میں نے دلی ہی دیکھی ہے سالے میں نے نکھلو دیکھا۔ میں نے اجمیر شریف دیکھا' میں نے کلیر شریف دیکھا۔ میں نے بلن شیر کی نمائش دیکھی۔ پٹھے دلی میں روز بائیسکوپ دیکھتا تھا روز جے بھارت' طوفان میل' دیو داس' نادر اچشمہ والی' سارے بائیسکول میں نے دیکھ ڈالے اور بیٹا تم نے مادھوری کو دیکھا ہے قسم اللہ پاک کی پٹاخہ ہے پٹاخہ۔ میں نے تو بمبئی کا ٹکٹ کٹا بھی لیا تھا۔ مگر میاں کیا بتاؤں بس رہ ہی گیا۔

خیر جی کا بمبئی کا حوالہ دینا تو زیادہ قابل توجہ بات نہیں تھی۔ اول تو یہ کہ اس نے بمبئی دیکھا ہی نہیں تھا ارادہ کرنے کا یہ ہے کہ ہر

ہونی انہونی بات کا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حسنو کا بمبئی سے کیا علاقہ۔ وہ کبھی کسی ایکٹرس پہ فدا ہوا ہی نہیں وہ بمبئی جانے کی کیوں ٹھانتا۔ ہاں اس نے رام پور کی بہت شہرت سن رکھی تھی۔ وہاں جانے کو اس کا جی بہت تلملاتا تھا ایک مرتبہ اس نے اعلان بھی کر دیا تھا کہ لو بھیا رات میرا جوتے پہ جوتا سوار تھا۔ اب میں نہیں رکتا۔ اور واقعی وہ تھوڑے ہی دن بعد چل بھی پڑا تھا لیکن اس کے بھید وہی جانے انسان کیا سوچتا ہے اور کیا ہو جاتا ہے علی گڑھ میں نمائش ہو رہی تھی اس نے سوچا ہٹاؤ نمائش بھی دیکھتے چلیں بس علی گڑھ پہ اتر پڑا جو کچھ گانٹھ میں تھا جوئے میں گنوا دیا تھا اور ہاتھ جھاڑتا گھر چلا آیا لیکن جہاں تک جی کے بمبئی جانے کا معاملہ ہے تو وہ تو ایک شیخی باز ہے۔ بھلا اس کے پاس اتنے پیسے ہی کب سکتے تھے کہ وہ بمبئی کا ٹکٹ خرید لیتا یہی دیکھ لو کہ وہ جانے کب سے کہتا چلا آ رہا تھا کہ بھیا میں تو دلی چلا اور دلی آج تک وہ نہ گیا اس کے تو سارے پروگراموں کا انحصار سٹہ کا نمبر نکلنے پر ہوتا تھا اور سٹہ کا نمبر ہی کبھی اس کے نام پہ نہ نکلا حالانکہ اس چکر میں وہ ہر مزار اور ہر تکیہ کے چکر کاٹ چکا تھا۔ ایک مرتبہ ولایت کے تکیہ میں ایک بڑے پہنچے ہوئے شاہ صاحب آئے تھے لیکن بڑے جلالی' ان کی ہیبت سے ہی جلال ٹپکتا تھا۔ یہ لمبے تڑنگے جوگیا لبادہ' کاندھوں پہ بکھری ہوئی کالی چمکدار زلفیں' آنکھیں سرخ انگارہ' بات کسی سے کرتے نہیں تھے سارے دن اور ساری رات اللہ ہو اللہ ہو چلاتے تھے جی نے جب ان سے سٹہ کا نمبر پوچھا تو ان کا بدن تھر تھر کانپنے لگا اور انہوں نے ایک اینٹ اس کے سر پر دے ماری۔ جی نے اینٹ کے معمہ کو فوراً سمجھ لیا اور جھٹ ان نمبروں پر داؤ لگا آیا لیکن بعد میں اسے اس بات کا بڑا صدمہ ہوا کہ اس نے اعداد کو الٹا کیوں نہیں کر لیا تھا۔

اب جی سٹہ کے معاملہ میں کچھ قنوطیت پسند ہوتا جا رہا تھا اور کچھ دنوں سے اس نے یوت بات بنانی شروع کر دی تھی اماں اب تو پاکستان بننے پہ ہی دلی چلیں گے۔ شاید اسی چکر میں اس نے اب مادھوری کی تصویر سے زیادہ قائداعظم کی تصویر پہ توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ اماں جی کو ایک تو اس بات کا غصہ تھا کہ ولیا خالہ اتنی دیر سے بیٹھی ہیں اور انہیں ابھی تک پان نہیں دیا ہے وہ بھی دل میں کہہ رہی ہوں گی کہ نگوڑے کیسے لوگ ہیں پان کے ٹکڑے سے بھی نہیں پوچھتے' پھر گلے ہوئے پان دیکھ کر ان کا جی اور جل گیا' انہوں نے قطعی انداز میں کہہ دیا تھا کہ ان گلے سڑے پانوں کو اس کمبختی مارے کے سر سے ماری لیکن ولیا خالہ ہی سمجھوتہ بازی پر اتر آئیں اے اماں جی اب آ گئے تو رکھ لو۔ کال لونڈے کو حیران کرو ہو اور پھر انہوں نے اپنی بات کو استدلال کا بھی تھوڑا سا سہارا دیا اور ایمان کی تو یہ ہے کہ جی بدنصیب بھی کیا کرے گاڑیوں پہ وہ آفت ٹوٹ رہی ہے کہ لوگوں کے رستے بند ہو گئے۔

اماں جی کا غصہ اب دوسری سمت میں بہہ نکلا لے تو ایک دفعہ پھر لڑ بھڑ کے ختم ہو جائیں۔ اس روز روز کی مار کٹائی سے تو جان چھوٹے۔

لیکن ولیا خالہ تو اور ہی موڈ میں تھیں۔فوراً بولیں ''اے خدا سے توبہ کرو پنجاب میں تو قتلام ہو رائے کہ سن سن کے ہولیں اٹھے ہیں۔اجی بس' اس کے غضب سے ڈرتا ہی رہے۔تو بھینا کینا اماں جی اب موم پڑ گئی تھیں۔مٹے کیوں جھنڈے پہ چڑ رہے ایں بھلا یہ کوئی شریفوں کے طور ہیں۔''

اب ولیا خالہ نے بھی پھریری لی اے نٹ میں نٹ۔

اماں جی نے فوراً گرہ لگائی اجی نٹ بھی اپنی برادری کو دیکھ کے بانس پہ سے اتر آوے ہے مگر ان مٹوں میں تو میں تو شرم وحیا بالکل رہی ہی نہیں۔

مشن کی امی نے تو ہمیشہ سیاست کے پھٹے میں پاؤں اڑایا ان کا پیمانہ صبر آخر کب تک نہ چھلکتا بولیں کہ یہ ساری آگ کانگرس کی لگائی ہوئی ہے۔

لیکن ولیا خالہ نے فوراً ان کی بات کاٹ دی بی بی اپنی لیگ کو بھی کم مت سمجھو آفت کی پڑیا ہے۔

اماں جی نے ترقی پسندی کا جھنڈا بلند کیا۔اے دونوں ہی اجڈ ہیں وہ جو کسی نے کہا ہے کہ نکلٹے کی ناک کٹی سوا ہاتھ اور بڑھی تو بھینا کینا کسی میں غیرت مروت تو رئی نہیں اے مشن کی امی اپنے نقطہ نظر کے یوں پرخچے اڑتے ہوئے دیکھ سکتی تھیں انہوں نے اس مرتبہ سیاست میں اور گہری ڈبکی لگائی۔اجی آپ لوگوں کو کچھ دین دنیا کی خبر تو ہے نہیں۔بات تو یہ ہے کہ مسلم لیگ پاکستان مانگتی ہے مگر کانگرس مسلمانوں کے حق کو نہیں مانتی۔تو نگوڑی لیگ ہی ذرا چھوٹی بن جائے۔اماں جی دب کر صلح کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتی تھیں۔لیکن مشن کی امی تو اپنی بات کے آگے کسی کی چلنے ہی نہیں دیتی تھیں۔اماں جی چھوٹے بننے کی بات نہیں ہے کانگرس تو لیگ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتی ہے۔

اے مشن کی ماں دودھ ہے کہاں؟ ولیا خالہ کی قنوطیت پسندی نے جوش کھایا اس عرصہ میں ایک خیالی وحی بن کر اماں پر نازل ہوا اور انہوں نے ولیا خالہ کی بات فوراً کاٹ دی۔بھلینا کینا وہ آندھی گاندھی کو بھی کیا سانپ سونگھ گیا وہ بھی کچھ نہیں کہتا۔

''اجی اماں گاندھی کہاں کے بھلے ہیں چور کا بھائی گرہ کٹ۔'' ولیا خالہ نے قطعاً محسوس نہیں کیا کہ وہ قنوطیت پسندی کے جوش میں مشن کی امی کے فرقہ پرستانہ نظریہ کی حمایت کر گئی ہیں۔

مگر اماں جی گاندھی جی سے ہمدردی رکھتی تھیں۔تنک کے بولیں اجی چلو یہ تو مت کہو۔آنکھوں دیکھتے تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔اس ڈوبے نے تو میل ملاپ کی خاطر فاقے کر کر کے اپنی جان کو تج ڈالا۔

مشن کی امی نے پھر ٹانگ اڑائی جی یہ گاندھی جی بڑے بگلا بھگت ہیں وہ تو یہ کہہ کے نچھدم ہو گئے کہ یہ سارا کیا دھرا انگریزوں کا ہے۔

اور اب اماں جی نے یکا یک اپنی ترقی پسندی کو عاق کر دیا۔ نہیں بہو یہ تو میں نہیں مانوں گی ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا خود کریں اور الزام دیں۔ دوسروں کو میں تو ایمان کی کہوں گی کہ فرنگی کے راج میں شیر بکری سب نے ایک گھاٹ پہ پانی پیا یہ تو کانگرس اور لیگ نے آفت بور کھی ہے۔

مشن کی امی کو اب ذرا شہ مل گئی تھی۔ انہوں نے اور اونچا اڑنے کی کوشش کی اماں جی بات یہ ہے کہ آزادی کے لئے تو قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔

اماں جی پھر بدک گئیں۔ اے خاک پڑے ایسی آزادی پر پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان اب وہ ہمارا نیم والا گھر تھا نا۔ اس میں اشرفیوں کی دیگ تھی۔ رات کو ایسی چھن چھن بولتی چلی جاتی تھی بس یہی آواز آتی تھی کہ بیٹا دے دے دولت لے لے۔ میں نے کہا نوج ایسی دولت پہ اپنے کلیجہ کے ٹکڑے کو کبھی نہ دوں۔ کہیں جانوں کو بھینٹ چڑھایا جاوے ہے۔

ولیا خالہ اب پھر کلبلا رہی تھیں اور بولنے والی ہی تھیں کہ ان کی نواسی اک سانحہ بن کر نمودار ہوئی اور وہ فیل مچائے کہ بیچاری اولیا خالہ کی بات منہ میں ہی رہ گئی اور انہیں چادر اٹھا کر گھر کو روانہ ہو جانا پڑا۔

افو میاں نے بال آخر اعلان کر ہی ڈالا کہ بیگم پاکستان چلنے کی تیاری شروع کر دو۔ افو میاں سے زیادہ پاکستان پہ کس کا حق ہو سکتا تھا مسلم لیگ میں یوں تو بھانت بھانت کا جانور جمع تھا۔ لیکن وہ تو کام میں ایسے جٹے تھے کہ انہوں نے کبھی دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ فسادات کے زمانہ میں تو وہ واقعی کچھ بے ہاتھ پیروں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ جب ادھر ادھر کے گانوؤں میں سے مسلمان لٹ لٹکر قصبہ میں جمع ہونے لگے تو انہوں نے بہت سوچا کہ ان لوگوں کو کہاں دھریں اور کیسے منگوائیں لیکن ان کی عقل نے بالکل کام نہیں دیا۔ لیکن انتخابات کے زمانہ میں انہوں نے وہ عقل کے گھوڑے دوڑائے تھے کہ جمعیتہ العلماء والوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ خیر یہاں پاکستان پر ان کے احسانات جتانا مقصود نہیں ہیں ذکر تو یہ تھا کہ انہوں نے اللہ کا نام لے کر پاکستان چلنے کی ٹھان ہی لی۔ لیکن انہوں نے گھر میں اعلان کرنے کو تو کر دیا اور مشن کی امی نے سفر کی تیاری کے چکر میں سامان کا تیا پانچا بھی شروع کر دیا لیکن اماں جی کی بات دیکھو کہ انہوں نے بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت کھڑی کر دی۔ ہجرت کے فلسفہ کو تو وہ خیر کیا سمجھتیں۔ انہیں تو ابھی یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ پاکستان بنا کدھر ہے؟ جب افو میاں نے انہیں پاکستان کا پورا نقشہ سمجھایا تو انہوں نے بڑا افسوس کیا کہ اے لوڈوبوں نے پاکستان

کہاں بنایا ہے۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ لیکن جب افو میاں نے پاکستان چلنے کی بات شروع کی تو وہ چار ہاتھ اونچی اچھل پڑیں اے ہم پہ کیا خدا کی مار پڑی کہ اللہ میاں کے پچھواڑے جائیں لو بھلا ہمیں کوئی اٹھاؤ چولہا سمجھا ہے کہ روز برتن بھانڈے سر پہ اٹھائے اٹھائے پھریں۔ مگر اماں جی اب یاں رہنے کا دھرم نہیں رہا ہندو مسلمانوں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ اے مٹے ماولے ہوئے ہیں وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اوچھے کے گھر تیتر باہر باندھو کہ بھیتر۔ نگوڑوں نے کبھی کچھ دیکھا ہو تو جانیں۔ اماں جی تو جدھر کل موڑ دو اسی طرف چل پڑتی تھیں۔

افو میاں نے بھی سوچا کہ اگر وہ اسی طرح ڈھب پر آ جائیں تو کیا مضائقہ ہے بولے کہ اماں جی ان سالے ہندوؤں کی ذہنیت بڑی تنگ ہے۔ انہیں حکومت مل گئی ہے تو زمین پہ قدم نہیں رکھتے۔

اے اور کیا خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ جو گنج کھجائے اللہ بخشے تیرے باپ کو کہا کرتے تھے کہ ہندو حکومت کرنا کیا جانیں تو بھی انہوں نے ہمیشہ نون تیل بیچا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا فرنگی نے سوراج دے دیا تو اترائے اترائے پھرے ہیں مٹے اوچھے ہیں اوچھے۔

تو اماں جی اب ان کے ساتھ گزارہ تو ہونے سے رہا۔ پاکستان چلے بغیر اب چارہ نہیں ہے۔ افو میاں سمجھ رہے تھے کہ اب زمین کافی ہموار ہو گئی ہے لیکن اماں جی جھانسے میں کہاں آنے والی تھیں ان کی ترقی پسندی کی رگ فوراً پھڑکی اے افو رہنے بھی دے۔ پاکستان والے ہی کون سے بھلے ہیں ولیا بتا تو رہی تھی کہ کراچی میں روز ڈاکہ پڑے ہے اور لاہور میں تو مٹوں نے آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے وہ جو کسی نے کہا ہے کہ نئی نائن بانس کا نہنا اے ہاں تو یہ کوئی شریفوں کی باتیں ہیں۔

موقعہ واردات پہ مشن بھی آ پہنچا تھا۔ اماں جی کی بات کو وہ یوں بھی روزہ کم دیتا تھا اور اب تو خیر پاکستان کا معاملہ تھا۔ اس نے اماں جی کی مخالفت کو قطعاً نظر انداز کر کے یہ بات فرض کر لی کہ سب پاکستان چل رہے ہیں چنانچہ اس نے مطالبہ کیا کہ باوا پاکستان میں چل کے قطب صاب کی لاٹھ دیکھیں گے۔

افو میاں بولے کہ بیٹا قطب صاحب کی لاٹھ پاکستان میں نہیں ہے وہ تو دلی میں ہے۔ اچھا باوا تاج بی بی کا روضہ دیکھیں گے۔ مشن نے ہاتھ کے ہاتھ دوسرا مورچہ تیار کر ڈالا لیکن افو میاں نے پھر ٹکا سا جواب دے دیا۔ اے تاج بی بی کا روضہ آگرہ میں ہے۔ پے در پے دو شکستوں نے مشن کی خود اعتمادی کا تو ڈھیر کر ہی دیا تھا اور اب اس نے بوجھ الٹا افو میاں پہ ہی ڈال دیا۔

''تو باوا پاکستان میں کیا ہے۔''

اورافو میاں بڑے پیار سے بولے۔ ''بیٹا پاکستان میں قائداعظم ہیں۔''

اجی قائداعظم ہیں تو ہوا کریں اماں جی پھر بکھر گئیں۔ ہم ٹانڈا باٹڈا لئے کہاں پھرتے پھریں اور پھر یکایک اماں جی نے ایک اور داؤ مارا اجی ہم چلے گئے تو بڑے بوڑھوں کی قبر پہ کوئی چراغ جلانے والا بھی نہ رہے گا۔

افو میاں سنبھلے ہوئے تو پہلے بھی کون سے تھے۔ لیکن اس مرتبہ تو چاروں شانے چت گرے لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات تو تھی نہیں۔ انہوں نے استدلال سے کب کون سا قلعہ فتح کیا تھا۔ جو بھی مہم سر کرلیتے۔ اس معاملہ میں تو ہمیشہ اماں جی کا ہی پلہ بھاری رہا۔ افو میاں بحث میں ہمیشہ ہارے۔ آخر میں وہ تو اسی پٹے پٹائے نسخہ پہ آجاتے تھے کہ کچھ بگڑے کچھ بسورے کچھ ٹسوے بہائے اور اس داؤں پہ اماں جی نے آج کیا ہمیشہ مار کھائی۔

جبی نے پہلے تو شفیا کی بات پہ ایمان لانے سے قطعی انکار کر دیا یوں بھی اب سٹہ میں اس کا نمبر نکل ہی آیا تھا اور بقول اس کے دلی چھوڑ ولایت تک کا کر یا اس کی گانٹھ میں تھا بس وہ قنوطیت پسندی کے موڈ میں تو بالکل نہیں تھا لیکن اس روشن حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ شیفنا نے ٹاؤن سکون کے ماسٹروں سے پٹ کٹ کر چوتھا درجہ پاس کیا تھا اور یہ بھی ہر شخص جانتا تھا کہ جغرافیہ میں اس کے نمبر سب سے زیادہ آئے تھے۔ پس جب اس نے اپنی علمیت کے زور سے یہ ثابت کر دکھایا کہ دلی پنجاب کے اس طرف نہیں بلکہ اس طرف ہے تو پھر جبی کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ البتہ حسنو کا معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔

اس کا یہ ایمان تھا کہ گاماں پہلوان امرتسر پہ سکھوں کا قبضہ نہیں ہونے دے گا اور یہاں آکر شیفنا کی جغرافیائی بصیرت نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے لیکن یہ ایمان کتنے دن جی سکتا تھا اور جب حسنو بھی اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا اس نے جبی کو پٹی پڑھائی کہ سالے اس روپیہ کو زنگ لگ جائے گا کچھ تاڑی کا موقعہ ہی رہے جبی خود اس فکر میں گھلا جا رہا تھا کہ یہ روپیہ خواہ مخواہ کا بوجھ بنا ہوا ہے کس طرح ٹھکانے لگایا جائے لیکن ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے کا پایا تھا کہ شیفنا نے دکان پہ آکے اعلان کیا کہ ''بے کچھ سنا دلی میں تو سن ستاون ہو رہا ہے۔''

جی پان لگائے لگائے اچھل پڑا اچھا بچ کیوے ہے

بھئی قسم اللہ پاک کی بس رنگ آریا اے۔

یار میں بھی تو کہوں کہ چکر کیا ہے دس وخت سالی کچھ سمجھ میں ای نئیں آکے دی تو یہ بات یوں ہے۔

اور پھر جبی نے حسنو کو نوٹس دیا کہ بے حسنو آج سے تاڑی بند۔

ہاں بے بند۔ بات یہ ہے کہ قومی جذبہ کے معاملہ میں تو حسو بھی کچھ ہٹیا نہیں تھا بلکہ جبی سے چار ہاتھ بڑھ کے ہی ہوگا پھر شیفتا کی بات سن کر تو اس کا بھی ادھر مرا ایمان جی اٹھا تھا۔ رحیمو پلہ دار سے اسے تاڑی خانہ میں یہ بات تو پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ ایک سکھ نے گاماں کے دس گولیاں ماریں اور گاماں نے دسوں گولیاں اپنے سینے پہ روک لیں پس جبی نے سیر کی بات کہی تو اس نے سوا سیر کی سنائی۔ اس نے کچھ داد طلب اور کچھ مشورہ طلب انداز میں اعلان کیا کہ تو پھر یارو ایک ایک پانی یاں بھی ہو جائے ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کئی۔

واہ پٹھے یہ کئی اے تو نے لاکھ روپے کی بات شیفتا کو آج سے سب سے زیادہ جوش آ رہا تھا۔

جبی کو جو تاؤ آیا تو اس نے تاڑی سے بچے ہوئے سارے روپے فنڈ میں دے ڈالے۔ اور اسی دن رات کو حسو نے نورا کو نوٹس دے ڈالا کہ دیکھ بے آج سے تیری میری یاری ختم۔ اب اگر تو نے میری طرف رخ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور دوسرے دن صبح کو حسو ہتھیلی پر سر رکھے تالے والوں سے مشورہ کرنے علی گڑھ روانہ ہو گیا۔

ہمت مرداں مدد خدا میں بھی شامل ہو ہی جاتی ہے چلتی گاڑی میں دھکا لگانا کون پسند نہیں کرتا۔ البتہ گرتوں کو ساقی نے بھی تمام کے نہیں دکھایا۔ حسو اگرچہ تنت وقت پہ جاگا تھا۔ لیکن بہت سے کام تو یوں چٹکی بجائے ہو گئے اور بے پیسے کے علی گڑھ کے تالے والوں نے اسے صرف مشوروں سے ہی نہیں نوازا بلکہ ٹوٹی پھوٹی چابیوں کا ایک ڈھیر بھی اس کے ساتھ باندھ دیا جولا ہوں والی مسجد کی چھت پر پانی کے نل کا ایک کھمبا نہ معلوم کب سے پڑا زنگ کھا رہا تھا اور کوئی اب تک یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ قدرت کو اس سے کون سا کام لینا منظور ہے لیکن حسو کی علی گڑھ سے واپسی کے فوراً بعد رات کو جب وہ چھت پر سے یکا یک غائب ہو گیا تو یہ بھید کھلا کہ ایجاد کی ماں ہر گری پڑی چیز کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے رہاں اسماعیل مستری کا معاملہ تو اس نے اگر حسو کے ساتھ دن رات ایک کر رکھا تھا۔ تو کسی پہ کیا احسان کیا۔ یہ اس کا قومی فریضہ تھا مختصر یہ کہ کچھ تائید خداوندی تھی اور کچھ محنتوں کا پھل کہ حسو کی پارٹی نے کچھ دال دلیا کر ہی لیا تھا۔ وہ تو اتنا بے تاب تھا کہ اس کا بس چلتا تو کل کے ہوتے آج مقابلہ اعلان کر دیتا لیکن شیفتا کی سنجیدہ مزاجی نے اسے روک رکھا تھا سنگھ والوں کے منہ لگنا تو اس نے ہمیشہ اپنی توہین سمجھا وہ تو سوچتا تھا کہ مسخروں اور چھچھوروں سے کیوں برابری کرائی۔ البتہ جب سردار سورن سنگھ تلوار لگائے سینہ پھلائے دکان کے سامنے سے نکلتا حسو کو پھریری سی آئی تھی اور اس سے نام پوچھنے کو اس کا جی بری طرح مچلتا تھا۔ لیکن یار لوگوں کی مصلحت اندیشی نے راستہ میں اڑ یکن لگا رکھی تھی۔

ایک روز جب اسماعیل مستری کا چھوٹا بھیا قاضی آباد سے بھاگ کر گھر پہنچا اور اس نے سارا ماجرا سنایا تو ایک دفعہ سب کے

پیروں تلے کی زمین نکل گئی شیفتا کو رہ رہ کر اس بات کا قلق ہوتا تھا کہ سبزی منڈی والے بروقت اپنی توپ سڑک پر فٹ کیوں نہ کر سکے۔ جی نے پاکستان کو بہت سنائیں کہ اس نے وقت پر دغا دی اور فوج نہیں بھیجی۔ حسنو اس ششش و پنج میں تھا کہ گاماں کے پٹھوں کو زمین سٹک گئی یا آسمان نگل گیا۔

اماں جی کے پاندان پہ آج تو واقعی روگ برس رہے تھے۔ دراصل اماں جی کے پاندان اور جبی کی دکان کے زوال کی داستان ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ چاند کے پاس اپنا کیا رکھا ہے۔ خدا بھلا کرے سورج کا جس کے دیئے ہوئے نور سے وہ اپنی گاڑی کھینچا ہے جبی نے ہی ہاتھ پیر ڈال رکھے تھے اماں جی کا پاندان بیچارہ کیا کرتا جی کے ڈھنگ ہی عجیب تھے کبھی پانی کی ڈھولیاں لایا کبھی نہ لایا قند کا وہ شوخ و شاداب کپڑا اب تو کچھ سوکھا سا پڑا رہتا تھا بیلے کے گجروں کا سلسلہ تو بالکل ہی بند ہو گیا تھا۔ قائداعظم کی وہ تصویر جو جبی بقول خود جامع مسجد کے بازار سے خرید کے لایا تھا غائب ہو گئی تھی۔ مشن تو بس اب ادھوری کی تصویریں ہی دیکھ دیکھ کے جیتا تھا بلکہ اس میں بھی ٹوٹا تھا اب جبی کی دکان کا یہ تھا کہ کبھی کھلی ہے کبھی بند ہے مشن بیچارے کو پانوں کے چکر میں دکان کے کئی چکر کاٹنے پڑتے تھے اور پھر بھی یہی سننا پڑتا تھا کہ روتا جائے مرے کی خبر لائے۔

اماں جی کے مرادآبادی پاندان کی رونق بھی اب غائب سی ہو گئی تھی جہاں تک صاف ستھرے پن کا تعلق ہے تو اس سے تو وہ پہلے بھی محروم تھا جگہ جگہ اس پہ کتھے چونے کے نشان پڑے رہتے تھے اور درون خانہ کے ہنگاموں کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ کتھے کے خانے میں چونا چھڑکا ہونا اور چونے کے خانہ میں کتھے کے دھبے پڑے ہونا بہت ہی عام بات تھی۔ بڑے ہشت پہلو خانہ میں کتری ہوئی اور ثابت چھالیا گڈمڈ رہتی تھی۔ اور سیدھے ہاتھ کا بیضوی خانہ تو خیر عمر عیار کی زنبیل تھا۔ اماں جی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ بالعموم اسی خانہ سے رجوع کرتی تھیں۔ سرمہ دانی' بریلی کے سرمہ کی شیشی' دانتوں کے منجن کی پڑیا' دوگوالیاری پیسے' موٹے دھاگوں کی لچھی اور اس میں اڑسی سی ہوئی ایک دو چھوٹی بڑی سوئیاں غرض یہ خانہ اچھا خاصا مال گودام تھا خاک شفا کی تسبیح جس کے دانے عاشورہ کو سرخ پڑ جایا کرتے تھے وہ بھی اسی خانہ میں پڑی تھی۔ آج جب انہوں نے پاندان کھولا تو کیا دیکھتی ہیں کہ تسبیح کے دانے سرخ ہو گئے ہیں۔ اماں جی کو یقین ہو گیا کہ ضرور معجزہ ہوا ہے۔ چونکہ یہ معجزہ جلالی تھا اس لئے انہیں اور تشویش پیدا ہوئی لیکن اب کیا کر سکتی تھیں پانی سر سے گزر چکا تھا ویسے بھی اب ان میں مدافعت اور مقاومت کی قوت ختم ہو گئی تھی اور پھر سے نہ چلنے کی بات اٹھانا گویا ہاری ہوئی فوجوں کا جارحانہ اقدام کرنا تھا۔ ایک دو دفعہ انہوں نے سپردگی کے عالم میں معجزے کا تذکرہ کیا اور پھر دم مار کے بیٹھ رہیں۔

ادھر افو میاں آج صبح سے سامان باندھنے میں جٹے ہوئے تھے اور پھر صرف سامان باندھنے کا کام تھوڑا ہی تھا ہر منٹ پہ تو

انہیں بازار جانا پڑ رہا تھا۔ آج نہ معلوم کتنی مرتبہ وہ جبی کی دکان کے آگے سے لپک جھپک کرتے ہوئے گزرے ہوں گے جبی تو خیر پی گیا لیکن حسنو کی زبان میں کون تالا ڈال سکتا تھا ایک دفعہ اس نے ٹوک ہی دیا افو میاں پاکستان اکیلے ہی سدھار رئے او۔

اور افو میاں نے بڑی بے ساختگی سے جواب دیا اماں اب فوج لے کے آئیں گے۔

حسنو بھلا کب بند تھا فوراً بولا کہ میاں فوج لانے والوں کی یہ صورتیں ہووے ہیں۔

اور ادھر جی نے بھی گلے ہوئے پانوں کو تراشے ہوئے گرہ لگا ہی دی افو میاں فوج کو تو چھوڑ کے جارے او۔

شام کو حسنو ایک لمبی سی جماہی لیتے ہوئے بولا کہ بے جبی۔

''ہوں۔''

''بے تاڑی واڑی کا ہی موقعہ رئے۔''

پیارے تو بھی کیا یاد کرے گا کہ پڑا تھا کہ کسی سیٹھ سے پالا' تو پٹھے آج ہی رئی۔

اور جب انسپکٹر صاحب جبی کی دکان پر پہنچے اور نتھی ستار کے لونڈے نے جس نے اپنی ساری خدمات سنگھ کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ انسپکٹر صاحب کے رازدارانہ انداز میں صورتحال سے آگیا کیا تو وہ بہت بھنائے کہ ہم آدمی نہ ہوگھن چکر ہو گئے تھانے سے اسماعیل مستری کے گھر گئے۔ اسماعیل مستری کے گھر سے یاں آئے اور یہاں سے تاڑی خانے جائیں۔

◆◆◆

پھر آئے گی

دلی رنگریز کا تو وہ معاملہ تھا کہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے ادھر عشرہ تمام ہوا۔ ادھر اس نے اگلے سال کے تعزیہ کے لئے تیاریاں شروع کر دیں اور اس دفعہ تو خیر بات ہی دوسری تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ پچھلے سال اس کا تعزیہ مولا کنجڑے کے تعزیے سے نیچا رہ گیا تھا اور اس شکست کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہا تھا۔ اس نے بھی اب کے دن رات ایک کر رکھا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اس محرم پر کسی نہ کسی طرح مولا کو نیچا دکھانا ہے۔ رفیا تیر گر بھی اپنے تعزیے میں بے طرح لگا ہوا تھا لیکن اس کا طرز نظر دلی سے مختلف تھا۔ وہ تعزیے کے قد و قامت پر نہیں جاتا تھا۔ بلکہ اس کے حسن کو دیکھتا تھا اس نے لمبا تڑنگا تعزیہ کبھی نہیں بنایا وہ مختصر اور محدود پیمانے پر کام کرتا تھا لیکن تعزیے کے ایک ایک گوشے میں اپنی صنعت گری کا کمال دکھاتا تھا۔ اس کا تعزیہ ٹھگنا ہوتا تھا لیکن ہوتا تھا جنت نگاہ۔ لیکن نتوا حلوائی نہ تو قد و قامت کے نظریہ پہ ایمان رکھتا تھا اور نہ تعزیہ سازی کو مرصع سازی سمجھتا تھا۔ وہ توپیچ اور ندرت کا شیدائی تھا اور یہ صحیح بھی ہے کہ اس نے تعزیہ کے فن میں کئی راہیں نکالی تھیں۔ اس مرتبہ پھر محرم جب بالکل سر پر آ گئے تو لوگوں کو یکا یک پتہ چلا کہ نتوا حلوائی نے بتاشوں کا تعزیہ بنایا ہے۔ نتوا کے حریفوں کو تو گویا سانپ سونگھ گیا اور بعض دشمنوں نے یہ اڑا دی کہ پچھلے چہلم پہ نتوا رامپور گیا تھا اور وہاں سے یہ نسخہ اڑا کر لایا ہے۔

لیکن نمبردارنی کے امام باڑہ میں جو تعزیے نظر آتے تھے وہ دوسرے ہی کینڈے کے ہوتے تھے وہ تو درحقیقت تعزیہ داری کے ایک الگ ہی میلان کی نمائندگی کرتے تھے۔ دلی، رفیا اور نتوا کے تکلفات کو نمبردارنی نے ہمیشہ زوال پسندی تصور کیا۔ چنانچہ ان کے امام باڑہ میں کبھی ایسا تعزیہ نہیں دیکھا گیا جس کے گنبد پر براق کھڑا ہو یا جس کی بالائی خراب میں کسی عورت کی تصویر نظر آ رہی ہو لدے پھندے اور لحیم شحیم تعزیوں کا جو تصور دلی، رفیا نتوا اور مولا کے یہاں نظر آتا تھا۔ اس کا سرے سے یہاں وجود ہی نہیں تھا۔

شب عاشور کو یہاں تعزیوں کی ایک پوری قطار نظر آتی تھی۔ بعض تعزیے کچھ قد آور ہوتے بعض ذرا پستہ قد اور بعض بالکل ہی ننھے منے ہوتے تھے لیکن ان سب میں ایک سادگی اور اثر کی کیفیت ضرور ہوتی تھی لیکن اس مرتبہ نمبردارنی کو عجب پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ علی گڑھ کی نمائش کو بھی اسی وقت آنا رہ گیا تھا۔ عزاداری کا سارا انتظام تو ان کے کارندے زوار حسین کیا کرتے تھے۔ ان کی سینئے کہ نمائش دیکھنے اڑ لئے۔ نمبردارنی عورت ذات، کیا کیا کرتیں۔ امام باڑے کی تپائی اور دہلائی۔ علموں کو پاک کرنا، ٹیکوں کو دھوپ

دکھانا پھر علموں کی چھڑیں اور چوکیاں اور منبر اور جھاڑ فانوس اور فرش فروش۔ ان سب کا جھاڑنا پونچھنا۔ اس کے علاوہ تعزیے بنانے والوں سے ابھی سے سودا نہ کیا جاتا تو تعزیئے کیسے بن سکتے تھے۔ پھر مجلسوں اور حاضری کے نانوں اور شیر مالوں کے لئے آٹے اور میدے کا انتظام بھی ابھی سے کرنا تھا۔ رہے تقن میاں تو انہوں نے یہ کام کب کب کئے تھے جواب کرتے۔ یہ بات نہیں ہے کہ انہیں آقائے کربلا سے عشق نہیں تھا۔ محرم میں سب سے زیادہ مصروف تو وہی نظر آتے تھے لیکن ان کی سرگرمیاں تو مختلف ہی تھیں اور متنوع بھی۔ عزاداروں کی کئی کئی مختلف اور متنوع ٹولیوں کی سرپرستی وہ بیک وقت فرماتے تھے۔ ابھی صف میں کھڑے ماتم کر رہے ہیں اور ابھی جہاں ذرا تاشوں کی گت بگڑی' تاشے بجانے والوں کی ٹولی میں کھڑے تاشہ بجا رہے ہیں۔ ماتم کرنے والوں کا ذرا ہاتھ ڈھیلا پڑا اور وہ تاشہ گلے سے اتار صف میں آن موجود ہوئے۔ کبھی وہ صف میں کھڑے کھڑے ہی ہاتھوں کے اشاروں سے تاشے والوں کی قیادت فرمادیا کرتے تھے۔ زنجیروں کے ماتم میں بھی وہ سب سے آگے نظر آتے۔ موقعہ موقعہ سے وہ نوحہ خوانوں اور سوز خوانوں کو بھی نوازدیا کرتے تھے۔ پورے دس دن میں اک محرم کی آٹھویں شب کو تو ضرور انہیں مجاوری کے سلسلہ میں تپا مار کر بیٹھنا پڑتا تھا ورنہ محرم میں تو وہ اچھے خاصے گھن چکر بن جاتے تھے۔ اب بھی انہیں فراغت نہیں تھی۔ ایک طرف زنجیروں کی تیاری اور مرمت ان کی سرپرستی میں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ملن کان میلیا' عنایت اور ممدان کی قیادت میں چوپال میں بیٹھے تاش منڈھ رہے تھے۔ پھر یہ فیصلہ بھی دراصل انہیں ہی کرنا تھا کہ اس سال جلوس ذوالجناح کی تقریب میں لکھنؤ کی انجمن حیدریہ کو مدعو کیا جائے یا شکارپور کی انجمن اصغری کو رہا مرثیہ خوانوں کا معاملہ تو یہ بات شیخ جی اور ممبر صاحب کے طے کرنے کی تھی اور یہ وہ طے کر چکے تھے کہ اس سال پھر دولہا صاحب کے شاگرد رشید بٹن صاحب کو بلایا جائے گا۔ بٹن صاحب کچھ عرصہ پہلے تک تو دولہا صاحب کے شاگرد ہی تصور کئے جاتے رہے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہوگئی تھی کہ کاظم نے لکھنؤ کی سیکرٹریٹ میں کلرکی کا بار سنبھالنے کے ساتھ ساتھ واقف راز درون میخانہ ہونے کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ چنانچہ پچھلے سال جہاں اس نے کمن صاحب تقن صاحب' ناصر الملتہ' نجم الملتہ اور نصیر الملت کے بارے میں بہت سی تحقیقات فرمائیں وہاں یہ انکشاف بھی کیا کہ یہ اپنے بٹن صاحب دولہا صاحب کے شاگرد واگرد نہیں ہیں۔ مفت میں رعب گانٹھتے ہیں۔ دراصل یہ ان کی چلمیں بھرتے تھے اور اب نخاس میں ان کی پنواڑی کی دکان ہے۔ یہ تحقیق بھی کاظم ہی کی تھی کہ بٹن صاحب کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا انہوں نے دولہا صاحب کے مرثیے صرف منہ زبانی یاد کر رکھے ہیں اور اگر وہ مرثیہ خوانی میں ڈرامہ اور مشاعرہ کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دولہا صاحب کی جوتیاں سیدھی کرنے کا کچھ تو نتیجہ نکلنا تھا۔

کاظم تھا تو لکھنؤ میں ملازم لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ محرم میں آن موجود نہ ہوا وہ تعطیلات کا انتظار کب کرتا تھا۔ تکرم لڑا لڑا کے

چاندرات ہی کو آن دھمکتا تھا۔ غم حسین کے ساتھ ساتھ ایک اور غم اس کی جان کو لگ گیا تھا اور ایک اس پہ ہی کیا ہے۔ علمدار حسین محسن شبر غرض ایک طرف سے سب ہی نیم چڑھے کریلے بنے ہوئے تھے۔ اب وہ بھی ان میں سے کسی کو گانٹھتی تھی یا نہیں۔ یہ ایک بالکل الگ سوال ہے اور اگر اس سوال پر غور کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ سوال اس ایک اور سوال کو جنم نہ دے دے کہ اسے اپنے عاشقان صادق کے وجود کا بھی احساس تھا یا نہیں۔ لیکن غیب کی باتوں پہ کیوں مغزا پچی کریں مسئلہ تو کاظم اینڈ کو کے عشق کا ہے۔ اب اس ٹھوس حقیقت میں بھی شبہ کیا جانے لگے تو اس کا جواب شبہ کی دوا تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہ تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ محض چلمن کو رنگین دیکھ کر مرمٹے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض نے اسے بس عقل سے پہچانا اور مان لیا کہ بعض پر خلوص عقیدت مند دیکھا دیکھی اس پر ایمان لے آئے تھے لیکن ان تمام تشکیکی اور قنوطیت پسند باتوں کا اس خلوص اور وارفتگی پر کیا اثر پڑتا ہے جس کا مظاہرہ ہمیشہ محرم میں اس کے آنے پہ کیا جاتا تھا۔ کاظم کو ہر مجلس اور ہر جلوس میں نوحہ پڑھتے وقت یہ احساس رہا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور یہ احساس کبھی اس کے نوحہ میں اک عمک پیدا کر دیتا تھا اور کبھی اسے بگاڑ ڈالتا تھا۔ شبر اور علمدار دونوں اگرچہ اس کے بازو تھے لیکن وہ کسی احساس کے ماتحت اپنی اداکاری سے یہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیتے تھے کہ نوحہ کے بننے بگڑنے کا انحصار بس ان پر ہی ہے۔ کاظم کے لکھنؤ جاتے ہی شبر اور علمدار میں ٹھن گئی۔

کاظم تو خیر مسلمہ صاحب بیاض تھا۔ اس کے خلاف چوں کرنے کی کون جرات کرسکتا تھا۔ لیکن جب اس کی عدم موجودگی میں شبر نے قائم مقام صاحب بیاض بننے کی کوشش کی تو علمدار نے علم بغاوت بلند کر دیا اور گروہ اکبری کے نام سے ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد تعمیر کر ڈالی۔ خدا خدا کر کے اس پہ رعب گانٹھنے کا ایک موقعہ علمدار کے ہاتھ آیا تھا وہ بھلا کیوں چوکنے لگا تھا محسن کی بیٹھک میں دن رات نوحہ خوانی کی مشق ہوتی تھی۔ نوحوں کی نئی نئی کتابیں دور دور سے منگائی گئیں۔ شوکت بلگرامی کی بیاض تو خیر ہر گھر میں مل جاتی ہے لیکن شوکت کے نوحے تو اب کلاسیکی ادب بن چکے تھے۔ وقت کے نئے تقاضوں کو تو دراصل شاعر اہل بیت نجم آفندی کے تبلیغی نوحے پورا کر رہے تھے چنانچہ علمدار نے بھی شاعر اہل بیت اور ان کے ہم عصروں کے ترقی پسند نوحے حاصل کرنے کی کوشش میں خون پسینہ ایک کر دیا۔ شبر کون سا کم تھا۔ ادھر بڑی حویلی میں جو سال بھر سے بند پڑی تھی شبر کی ٹولی نے نوحہ خوانی اور سینہ زنی کا ریہرسل شروع کر دیا۔ نئے نوحوں اور نئی دھنوں کا کام اگرچہ کاظم کے سپرد تھا لیکن اس کی غیر حاضری میں شبر نے بھی تھوڑی سی اپج کا مظاہرہ کیا تھا شوکت بلگرامی کے کئی پرانے نوحوں کی برتی برتائی دھنوں میں تھوڑا سا اجتہاد کر کے اس نے انہیں نئی شکل دے دی۔ نوحہ خوانی کے معاملہ میں شدن تو بالکل کورا ہی تھا وہ دراصل ماتم کا مرد میدان تھا۔ فی الحال اسے نوحے لکھنے کے کام پر لگا دیا گیا تھا

لیکن ایک معاملہ میں وہ ان سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ اگر اس کی بات کا اعتبار کیا جائے تو اسے یہ امتیاز حاصل تھا کہ چلمن کی رنگینی کو پھلانگ کر وہ رخسار کی سرخی کو بھی دیکھ آیا تھا۔ شدن کا طور دراصل نرالا ہی تھا۔ سپردگی اور وارفتگی کی اس کیفیت کی جو کاظم کے طرزِ عمل میں پیدا ہوگئی تھی اس نے ہمیشہ جھوٹا جھگڑا سمجھا کسی کے لئے اس کی چاہت دل کی لگی ہوا کرے وہ تو اسے دل لگی سمجھتا تھا لیکن کاظم کے لئے یہ ایک اچھا خاصا روحانی مسئلہ بن گیا تھا۔ اس سال بھی اگرچہ وہ لکھنؤ میں کلرکی کے پاپڑ بیل رہا تھا لیکن اس کے خیال سے غافل نہیں تھا ایک طرف تو وہ نئے نئے نوحے بٹورتا پھر رہا تھا اور چنانچہ تک بھڑا بھڑو کے اس نے کئی نئے نوحے اچک ہی لئے۔ پھر وہ ان کی دھنیں معلوم کرنے کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف اس نے کسی نہ کسی طرح وائل کا سیاہ کرتہ بھی سلوا ہی لیا اور ایک کرتا ہی نہیں سلوایا بلکہ ایک بنیائن اور ایک بھڑکدار رومال بھی خرید ڈالا۔ غرض محرم کے لئے وہ کیل کانٹے سے لیس ہو لیا تھا۔

چاندرات کی شام کو عین عالم انتظار میں ایک اکہ ڈگمگ ڈگمگ کرتا حویلی کے چبوترے کے سامنے سے گزرتا چلا گیا اور یار لوگوں میں ایک شور مچ گیا کہ کاظم آ گیا۔ کاظم آ گیا۔ کاظم اپنے گھر پہ بستر بوریا پھینک سیدھا تیر کی طرح بڑی حویلی کے چبوترے پہ پہنچا اور بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ "بھیا دو ہندی کے تبلیغی نوحے نجم آفندی کے لایا ہوں اور ایک نوحہ فضل نکھلوی کا یاد کیا ہے جس کی ہوا ابھی نکھلو والوں کو بھی نہیں لگی اے۔" اور پھر اس نے یکا یک مخالف سمت میں چھلانگ لگائی اے شبر فلاں فلاں شخص آ گیا۔

"اے یار ابھی کہاں میں تو روز رستہ دیکھ رہا ہوں۔"

اور کاظم کو یہ سوچ کر بڑا سکون سا محسوس ہوا کہ وہ واردات ہونے سے پہلے آ پہنچا ہے۔

مختار صاحب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ لوگ ان کی مجلس کو خاطر میں نہیں لاتے ان کے یہاں تبرک بھی معقول قسم کا بٹتا تھا۔ امام باڑہ بھی خاصا سجایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ ان کی مجلس سے کنی کاٹتے تھے۔ اس میں نہ تو رقت ہوتی تھی نہ زور کا ماتم اور نہ ڈھنگ کا نوحہ پڑھا جاتا تھا۔ ان کی یہ شکایت بے جا نہ تھی لیکن اس میں تھوڑا سا شائبہ خوبی تقدیر کا بھی تھا مجلس ہوتی ہی تھی ایسے غیر وقت میں کہ معقول آدمیوں کو اس میں شریک ہونا دوبھر ہو جاتا تھا۔ شام کو لوگ اول تو دن بھر کے تھکے تھکائے ہوتے تھے۔ پھر اس وقت سے تو رات کے پروگرام کی تیاریاں شروع ہوتی تھیں۔ دن کے تمام توڑتے ہوئے پروگرام میں شرکت کی کسے سرت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ وقت گاڑی کے آنے کا بھی تھا اور لوگ پردیس سے آنے والے عزاداروں کے منتظر نظر آتے تھے اور آج تو ویسے بھی محرم کی سات تھی کسی کو مہندی کی فکر تھی کوئی منت کے چھلے بنوانے کے چکر میں تھا۔ بعض چڑھاوے کے لئے جلیبیاں اور موم بتیاں خریدتے پھر رہے تھے۔ بہت سے رات کی مجلسوں کے لئے گیس کے ہنڈوں کے انتظام میں گھرے ہوئے تھے ایسے میں مختار صاحب کی مجلس

پھیکی نہ رہتی تو اور کیا ہوتا۔ مختار صاحب کی ہائے توبہ سے متاثر ہو کر تقن میاں نے بھی ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا لیکن چند بڈھوں ٹھڈوں اور بہت سے بچوں کچوں کے سوا وہ کسی اور کو گھیر کے نہ لا سکے۔ سامنے مسجد کی چوکی پر علمدار ڈٹا بیٹھا تھا۔ لیکن تقن میاں کو اس نے کورا جواب دے دیا کہ ''اجی میرا تو گلا بالکل بیٹھ گیا ہے اب ملٹھی چباؤں گا تب ذرارات کو نوحہ پڑھنے کے قابل ہوں گا۔'' ایک کاظم پہ کی موقوف دوسرے بھی اپنی اپنی جگہوں پر جمے بیٹھے تھے۔ مسجد کی دوسری چوکی شبر نے تیسرے پہر ہی سے آ کر سنبھال لی تھی مسجد سے چار قدم آگے اگلی کے نکڑ پر کاظم بجلی کے کھمبے سے لگا کھڑا تھا۔ محسن کو جب کوئی ڈھنگ کا ٹھکانہ نہ مل سکا تو اس نے مسجد کی دہلیز ہی پر ڈیرہ ڈال دیا۔ تقن میاں نے اپنی سی ہر کوشش کر دیکھی لیکن کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجلس میں جانے کا ہوش اس وقت تھا کسے سب کی نگاہیں دور فقیرا حلوائی کی دکان کے سامنے سڑک کے موڑ پر لگی ہوئی تھیں محلے میں داخل ہونے والا ہر اکہ اسی سمت سے نمودار ہوتا تھا۔ فقیرا کی دکان کے عین سامنے پہلے اکہ کی چھتری نظر آتی تھی اور نظر آنے کے ساتھ ساتھ ایک زور کا جھونٹا لیتی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اکہ کے پورے خدوخال نمایاں ہوتے۔ اکہ قریب ہوتا جاتا کھڑ کھڑ کی آوازیں تیز تیز ہوتی چلی جاتیں چھتری کے جھونٹے کبھی آہستہ ہوتے کبھی تیز اور جب اکہ مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا تو یکے پرتنی ہوئی چادر کے کسی ایک سوراخ میں کوئی شاداب آنکھ چھلکتی نظر آ جاتی یا کسی گوشے سے کوئی بچہ مٹر مٹر آنکھیں گھماتا دکھائی دیتا۔ ہر اکہ جب نظر آتا تو شبر کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں اور محسن پہلو بدلنے لگتا اور علمدار کا دل دھک دھک کرنے لگتا اور اکہ گزر رے چلا جاتا۔ پھر وہ دوسرے اکہ کا رستہ تکنے لگتے۔ کاظم اگرچہ دور کھمبے سے لگا کھڑا تھا۔ لیکن اس کا دل بھی ان کے ساتھ ہی دھڑکتا اور ان کے ساتھ ہی ڈوبتا تھا۔ وہ کھمبے پہ اک زور کا مکا مارتا اور پھر کھمبے سے اپنے کان لگا دیتا کھمبے کے خول میں ایک مبہم قسم کی موسیقی جاگ اٹھتی۔ وہ رفتہ رفتہ یوں محسوس کرتا کہ دور کسی دوسری دنیا سے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی موسیقی بہتی چلی آ رہی ہے اور وہ اس میں گم ہوا جا رہا ہے۔ لیکن جوں جوں اس کی لذت کی کیفیت بڑھتی جاتی توں توں کھمبے کی موسیقی مدھم پڑتی جاتی۔ وہ پھر زور کا مکا مارتا اور کھمبے کے خول میں تاروں کی جھنکار سے پھر وہی مبہم موسیقی جاگتی اور رفتہ رفتہ ڈوبتی چلی جاتی۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ اس نے یہ عمل دہرایا تھا وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کتنی دیر سے کھڑا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ یہاں صدیوں سے اسی عالم میں کھڑا ہے اور اس مبہم موسیقی کو سن رہا ہے جو بار بار اس کے شوق کو بھڑکا کر اسے جل دے جاتی ہے۔ ایک اکہ آیا پھر دوسرا آیا' پھر اکوں کا تانتا بندھ گیا۔ پھر یہ تانتا چھدرا پڑ گیا۔ محسن بے چینی سے پہلو بدلنے لگا علمدار کا پاؤں سو گیا تھا۔ اب اکڑوں بیٹھنے کی بجائے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں چوکی سے نیچے لٹکا دیں شبر کی پیٹھ بھی دیوار سے لگ گئی تھی۔ کاظم کا ہاتھ دکھنے لگا۔ کھمبے سے وہ خالی کان لگائے کھڑا تھا۔ وہ مبہم شیریں موسیقی معدوم

ہو چکی تھی۔اس کی جگہ ایک سیٹھی بیرنگ سنسناہٹ گونج رہی تھی اور اتنے میں شدن لپکا ہوا آیا اور علمدار کے کان میں قدرے بلند آواز میں کہا کہ "بے وہ تو آ گئی۔"

"اجی ہاں؟ علمدار اچھل پڑا۔"

محسن چھری لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔شبر چوکی سے کود کر شدن کی طرف لپکا۔کاظم نے کھمبے کے پاس کھڑے کھڑے جب یار لوگوں کو یوں سر جوڑے دیکھا تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔لپک کر وہ بھی آ پہنچا۔

مگر یار شبر اس خبر پر پورے طور پر ایمان نہیں لایا تھا۔اگر آتی تو اس کا اکہ تو ادھر سے ہی نکلتا۔

لیکن شدن نے فوراً اس کی توجیہ کر دی۔بھیا ان کے ساتھ سامان بھی تو منوں تھا۔اس سالے شفیا اکہ والے نے انہیں یہ پٹی پڑھائی کہ قصائیوں کی گلی سے نکل چلو۔واں سے کوئی لونڈا سامان اٹھانے کے لئے ساتھ لے لیں گے۔

شدن کی توجیہہ نے رہے سہے شبہ کو بھی ختم کر دیا۔یوں بھی فضا کچھ اس قسم کی پیدا ہو گئی تھی جس میں بحث و استدلال بے تکی اور بے معنی چیز نظر آتی تھی۔

8 محرم کی شب تھی۔امام باڑوں میں بے تحاشا رونق تھی اور نمبردارنی کا امام باڑہ تو چوتھی کی دلہن بنا ہوا تھا۔نمبردار صاحب کے زمانہ کی خیر بات ہی اور تھی۔لیکن ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اب بھی کمی نہیں آئی تھی۔محرم میں کون سا عزاخانہ نہیں سجتا۔لیکن اس عزاخانہ میں ایک چھوڑ کئی چیزیں ایسی تھیں جن کا براہ راست کربلائے معلی کی زمین سے ناطہ تھا۔بات یہ ہے کہ نمبردار صاحب کربلا کی زیارت کا شرف حاصل کر چکے تھے اور وہاں سے مختلف تبرکات بھی لے کر آئے تھے لیکن سید گل زباغ علی نے ان کے اس امتیاز میں بھی کیڑے ڈال دیئے ایک اتنی سی بات پر کہ نمبردار نے کئی سال سے ان کی زمین کا محصول نہیں دیا تھا۔انہوں نے تاؤ میں آ کر یہ شعر کہہ ڈالا۔

کرب و بلا گئے تھے شور و شین سے
ایمان لپٹ کے رہ گیا قبر حسین سے

یہ تو دراصل سید گل زباغ علی کی دھاندلی تھی ورنہ یہ امام باڑہ بھی ان کے ایمان کا اچھا خاصا اشتہار تھا۔امام باڑے کے اندرونی کمرے میں جہاں علم سجے ہوئے تھے۔ایک سے ایک بڑھا ہوا تبرک نظر آ رہا تھا۔نجف اشرف اور کربلائے معلی کی تصویروں کے برابر سجے ہوئے ذوالجناح کی پروقار تصویر آویزاں تھی۔ان سے الگ بائیں سمت کی دیوار پر دو تصویریں خاص اہتمام سے لٹکی ہوئی

تھیں۔ان میں ایک تو حضرت عباس کی اس حال میں شبیہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار کاندھے پہ مشکیزہ لادے ایک ہاتھ میں علم لئے اور دوسرے ہاتھ سے تلوار چلاتے اڑے چلے جارہے ہیں ان تصویروں کے علاوہ باقی طغرے تھے۔ایک بڑے سے شیشہ پر بہت نفاست کے ساتھ سرخ رنگ میں یہ شعر لکھا گیا تھا۔

شاہ مرداں شیر یزداں قوت پروردگار
لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

ایک دوسرے قدرے مختصر شیشے پر بیل بوٹوں سے گھری ہوئی بیضوی خلا میں ''حسین منی وانا من الحسین'' لکھا ہوا تھا۔محرابوں اور طاقوں میں لوبان اور اگر بتیاں اڑسی ہوئی سلگ رہی تھیں۔ان سے اٹھتے ہوئے ہلکے ہلکے خوشبودار دھوئیں نے سجے ہوئے علموں کے تقدس کو تھوڑا سا اور چمکا دیا تھا اور کمرے کی پوری فضا میں ایک پراسرار کیفیت پیدا کردی تھی۔سرخ سبز ریشمی ٹپکوں میں سے جھانکتے ہوئے چمکدار علم چوکی پہ قطار باندھے ہوئے دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ان علموں کے پنجے زیادہ تر تانبے کے بنے ہوئے تھے اور بڑے بڑے تھے لیکن دائیں سمت میں جو دو چھوٹے چھوٹے نقشین علم کھڑے تھے وہ چاندی کے تھے اور حضرت عون ومحمد کی ذاتوں سے منسوب تھے انہیں علموں کے برابر ایک ننھا منا سونے کا علم سرخ ریشمیں ململ کے ٹپکے میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔اس ننھے علم کو نووارد سمجھئے پچھلے سال ہی تو نمبردارنی نے منت مانی تھی کہ اگر تقن کی دلہن کی گود بھر گئی تو حضرت علی اصغر کے نام کا ایک سونے کا علم چڑھاؤں گی لیکن سب سے بڑھ چڑھ کر تو بڑا علم تھا جو اس وقت اس کمرہ سے باہر ہال میں سجا رکھا تھا نمبردار صاحب سے روایت ہے کہ جس سال وہ کربلائے معلیٰ گئے تھے وہاں دریائے فرات سے ایک علم کا پنجہ برآمد ہوا تھا اور یہ باور کرنے کے وجود موجود تھے کہ وہ حسینی فوج کے علم کا پنجہ تھا وہ پنجہ تو خیر لکھنو کے امام باڑے میں چلا گیا۔لیکن نمبردار صاحب نے وہیں ایک پنجہ تیار کرایا اور اسے اس تاریخی پنجہ سے چھوا لیا۔نمبردار صاحب ہی یہ بھی بتاتے تھے کہ لکھنو کے امام باڑے میں مظاہرے کے وقت نہ معلوم کیا بے ادبی ہوئی کہ پنجہ چھڑ سے نکل کر چھت کو پھاڑتا ہوا جانے کدھر نکل گیا اور پھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔اس علم کی یادگار لے دے کے یہی علم رہ گیا تھا۔آج رات کو جو نمبردارنی کے امام باڑہ میں اتنی چہل پہل تھی وہ بھی اسی کے دم کا ظہور تھا۔اس علم کی چھڑ اس قدر بلند تھی کہ پنجہ کا کنارہ امام باڑہ کی گارڈر والی اونچی چھت سے جا لگنے سے بال بال بچ گیا تھا اس بلند و بالا علم کی شوکت میں اس ڈھیلے ڈھالے سفید لٹھے کے ٹپکے نے اور اضافہ کر دیا تھا۔جس پہ جا بجا سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔اس کے سائے میں تقن میاں گلے میں کلاوا پہنے مجاور بنے بیٹھے تھے اور ان کے برابر نمبردارنی براجمان تھیں سامنے کھیلوں بتاشوں کا ایک ڈھیر لگا تھا جس میں جا بجا جلیبی اور پیڑے اور قلاقند کے

ٹکڑے چمکتے نظر آ رہے تھے۔ چڑھاوا چڑھانے والیوں کا وہ ہجوم تھا کہ تقن میاں اور نمبر دارنی دونوں کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ سارے امام باڑہ میں بیبیاں ہی بیبیاں نظر آتی تھیں یا پھر وہ لڑکے اور مرد تھے جو چھوٹی شہزادی کی سقائی کی تقریب سے اپنی ماں بہنوں کے ساتھ آئے تھے شدن کمر میں سرخ پٹکا باندھے گلے میں مشک ڈالے بچوں اور بچیوں کے حلقے میں کھڑا تھا اور دودھ کے شربت کا آدھا آدھا کٹورا سب کے بانٹ رہا تھا۔

احاطہ کے اندر امام باڑہ کے دروازہ پر علمدار کھڑا یہ سوچ سوچ کے تاؤ کھا رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے سقہ بنانے کی منت کیوں نہیں مانی تھی۔ شبر اور محسن کئی مرتبہ ہتھیلی پہ سر رکھ کے امام باڑے کی دہلیز پھلانگ گئے لیکن آگے نہ بڑھ سکے۔ کاظم علمدار سے پیچھے ہٹ کر ایسے زاویے پر کھڑا تھا۔ جہاں سے امام باڑہ کے اندر کے ہنگامہ کے ساتھ ساتھ باہر گلی کی کیفیت پر بھی نظر رکھی جا سکتی تھی۔ دور گلی کے نکڑ پر جب موم بتیوں کا جھلملاتا ہوا دائرہ دکھائی پڑتا تو اس کے جسم میں یکایک ایک سرسراہٹ سی پھیلتی چلی جاتی۔ دائرہ قریب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا۔ پھر ادھیڑ عورتوں جوان لڑکیوں اور کمسن بچیوں کا ایک گڈمڈ حلقہ اگر کی بتیوں۔ گندھے ہوئے آٹے کے چراغوں' موم بتیوں' جلیبیوں اور کلادوں اور پھلوں سے لدی پھندی سینی کو لئے گزر اچلا جاتا اور کاظم کی نگاہیں بدستور کسی کو ڈھونڈتی رہ جاتیں سامنے احاطہ کے بیچ میں گیس کے ہنڈے سے نکلتی ہوئی سن سن کی آواز میں ایک اکتادینے والی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ اس کے گرد پروانوں کا وہ تیزی سے گھومتا ہوا ہالہ اب چھدرا بھی ہو گیا تھا اور دھیما بھی البتہ سٹینڈ کی پینڈی میں بادامی پروں کے انبار میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ امام باڑے کی پیشانی پر سنگ مرمر کی مستطیل تختی پر یہ شعر اسی ایک انداز سے چمکے جا رہا تھا۔

مومنو آؤ جو کوثر کی طلب گاری ہے
چشمہ فیض حسین ابن علی کا جاری ہے

اور شدن بھی بال آخر امام باڑے سے نکل آیا۔ تلاشتے کو اس کی مشک تھما کر وہ علمدار کاظم کے پاس پہنچا۔

یارو آج تو خوب جلوے رہے۔ شدن نے بحث کا آغاز کیا۔

سالے تیرے تو مزے آ گئے۔ شبر بولا۔

لیکن شدن نے خاکساری سے کام لیتے ہوئے فوراً اعلان کر دیا کہ یار مزے تو بس تقن کے یہاں کے تھے۔

کاظم بری طرح کلبلا رہا تھا۔ اس نے جب بحث دوسرے رخ پر جاتے دیکھا تو بال آخر اس نے خود ہی سوال کر ڈالا یار اپنی وہ تو آئی نہیں۔

شدن فوراً تڑپ کر بولا وا بے مرغی کے آئی کیسے نہیں تھی؟

اجی ہاں؟ علمدار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

شبراور محسن کا دل دھڑکنے لگا اور کاظم سکتے میں آ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے یوں محسوس ہوا کہ نمبر دارنی کا پورا امام باڑہ گھوم رہا ہے امام باڑے کی چھت میں لٹکے ہوئے جھاڑ فانوسوں پر دھند چھائی جارہی ہے اور امام باڑے کی پیشانی پر سنگ مرمر کی مستطیل تختی پر شعر سمٹ رہا ہے معدوم ہو رہا ہے۔

تاشوں کی آواز تو خیر بہت پہلے سے آنی شروع ہوگئی تھی لیکن جب اس نے گھر سے قدم نکالا تو اسے محسوس ہوا کہ تاشوں کی آوازوں میں نوحہ و ماتم کا ایک ملا جلا مبہم ہنگامہ بھی لپٹا چلا آرہا ہے۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ بناؤ سنگھار کرنے میں اسے کافی دیر لگ گئی تھی۔ وائل کا سیاہ کرتہ تو خیر وہ وہی پہنے ہوئے تھا جو اس نے پہلی محرم کو پہنا تھا لیکن اتنا نیا پن اس نے ضرور برتا تھا کہ اس کے نیچے آج سفید بنیان پہن لیا تھا اور اس کی وجہ سے کرتے کی رونق میں چار چاند لگ گئے تھے سر میں اس نے گولے کا تیل ڈال رکھا تھا اور بالوں کو سنوار کر ایک انداز سے بگاڑا تھا گلے میں ریشمیں رومال تھا اور اس پورے بناؤ نے اس کے حرکات وسکنات میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا تاشوں کی آواز نکھرتی گئی تاشوں کے اس نکھرے ہوئے شور میں نوحے کا ایک مصرعہ بار بار لپٹا چلا آتا تھا۔

لاچار حسینا بے یار حسینا

جلوس اب چوپال سے آگے نکل آیا تھا اس نے ایک دو لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہجوم کے کنارے کو جا چھوا جب اس نے دیکھا کہ نوحہ علمدار پڑھ رہا ہے تو بہت پتا نوحہ اس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا اور علمدار اپنے پورے اکتسابی سوز اور شدت کے ساتھ یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

درا نہ عدو بے اور بانہ ہوئے داخل
گھر فاطمہ کا ہو گیا بازار حسینا

علمدار کے پیچھے تھوڑا سا ہٹ کر ذوالجناح کھڑا تھا۔ اس کے سفید جسم پر لٹھے کا لمبا چوڑا کپڑا پڑا تھا جو اس کے گٹوں کو چھوتے چھوتے رہ گیا تھا۔ علامتی ساز و سامان سے لدے پھندے اس گھوڑے کے دائیں اور بائیں سے ماتمیوں کی صفیں شروع ہو کر دور تک چلی گئی تھیں ان صفوں کی انتہا ان دو تلواروں والے علم کو سمجھئے جسے مولا کھڑا ہوا تھوڑی تھوڑی دیر بعد بہت تیزی سے گھمانے لگتا تھا۔ مولا

سے اک قدم ہٹ کر ملن کان میلیا کی قیادت میں شاتے والوں کی ٹولی اپنے کام میں مصروف تھی۔ عنایت تاشہ بجاتے بجاتے اپنے منہ کو ممد کے کان کے ذرا قریب لا کر بولا۔ ''بے ممد دیکھ ریا اے۔''

ممد کی نگاہیں یکایک اوپر اٹھ گئیں۔ مختلف چھجوں کوٹھوں اور کھڑکیوں سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں ڈاکٹر صاحب کے چوبارے کے اس خاص کونے پر جا کے ٹک گئیں۔

عنایت بے۔ ہونہ ہو یہ تو وہی ہے۔ اور عنایت نے منہ بنا کر جواب دیا۔ چھوڑ یا مجھے تاشہ بجانے دے۔

اور یہ کہتے کہتے اس کے تاشے کی گت بگڑ گئی۔ تقن میاں ماتمیوں کی صف سے ٹوٹ کر بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے چلے اور تاشے والوں کے حلقہ کے اندر آن دھمکے۔ عنایت کے گلے سے تاشہ اتار انہوں نے اپنے گلے میں ڈال لیا اور قائدانہ انداز میں تاشے والوں کو روک کر نئے سرے سے تاشہ بجانا شروع کیا۔ تاشے والوں نے تاشے کی آواز کو ماتم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ماتم کرنے والوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکات کو تاشے کی ضربوں سے ہم آہنگ کرنا چاہا تاشوں پر قمچیاں پہلے آہستہ آہستہ پڑنی شروع ہوئیں۔ ضربوں کے درمیان وقفے واضح اور کھلے کھلے تھے۔ پھر یہ وقفے تنگ ہونے لگے اور ماتمیوں کے ہاتھ تیزی سے اٹھنے لگے۔ پھر یہ وقفے اور سمٹے اور ضربوں میں اور شدت پیدا ہوئی۔ ماتم اور زور سے ہونے لگا۔ شدن کا ہاتھ سینہ پر پڑ رہا تھا اور نگاہیں کہیں اور منڈلا رہی تھیں۔ علمدار اگرچہ بار کنکھیوں سے چھجوں اور کوٹھوں کی طرف دیکھ لیتا تھا لیکن کیا مجال کہ ماتم کی باقاعدگی اور تیزی میں ذرا فرق آجاتا۔ کاظم کے ہاتھ کی تے نگاہوں کی بے چینی کی وجہ سے ادھر بگڑی اور ادھر مخالف صف سے تقن میاں نے ڈانٹ بتائی اور کاظم پھر یکسو ہو کر ہاتھ چلانے لگا۔

جلوس بڑھتا چلا گیا۔ پھر فقیرا حلوائی کی دکان آگئی۔ جلوس مڑ کر بازار میں آگیا اور محلہ کے اودے اودے نیلے نیلے پیرہنوں سے لبریز وہ چھجے، کوٹھے اور دریچے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ علمدار کی نوحہ خوانی کا جوش دھیما پڑ گیا وہ جلوس سے آہستگی سے سرک آیا۔ شدن خاموشی سے صف سے کٹ کر پیچھے آگیا پھر جلوس میں سے شبر نکلا سب سے آخر میں کاظم آیا۔ تھکن اور ایک قسم کی مایوسی کی کیفیت اس کے ذہن پر طاری تھی۔ شدن مختلف چہروں کے خطوط اور ساخت پر گفتگو کرتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتا ہوا سنی کو ان سنی کرتا ہوا چلتا رہا۔ لیکن جب شدن نے سوال کیا کہ یار وا سے بھی دیکھا؟ تو سب کے ساتھ ساتھ کاظم بھی چونک پڑا کسے؟

''غو ہی فلاں فلاں شخص۔''

کہاں تھا؟ شبر نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

یار و تم سب بانگڑو ہو۔ اب یہ ڈاکٹر صاحب کے چوبارے کے اس آخری کونے پہ کون تھا۔ علمدار ہکا بکا رہ گیا۔ شبر کہہ رہا تھا یار و لمڈیا غچہ دے گئی۔ اور کاظم کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے گلے میں بندھے ہوئے رومال کی گرہ تنگ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

قورمہ کے پیالوں اور بریانی کی بوٹیوں کی جو افراط وکیل صاحب والی ٹولی کے دستر خوان پر تھی وہ دوسروں کے سامنے نظر نہ آتی تھی۔ شدن اس بات پہ تپ رہا تھا کہ وکیل صاحب اور ان کی ٹولی میں سے کسی کا بھی فاقہ نہیں تھا۔ لیکن فاقہ شکنی کے وقت سب سے زیادہ انہیں کے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ علمدار کا اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ صف میں آ کر کبھی ماتم نہیں کرتے لیکن حاضری کے موقعہ پر کیسے سب سے آگے بیٹھتے ہیں۔ خود تقن میاں کی رائے ان لوگوں کے بارے میں کچھ اچھی نہ تھی۔ انہوں نے اس بات پر ہمیشہ انگشت نمائی کی وکیل صاحب کسی جلوس میں کبھی شریک نہیں ہوتے مانگ بنائے براق بنے۔ ناک پہ رومال دھرے سب سے الگ اپنے چبوترے پہ شجر ممنوعہ کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تاؤ تقن میاں کو اس بات پہ آتا تھا کہ وہ اور تو اور عشرہ کے دن بھی برہنہ پا نہیں ہوتے لیکن طوعاً کرہاً وہ بھی اس وقت ان کی خاطر کہہ ہی رہے تھے اور عزادار حسین نے تو گویا اپنی توجہ ہی ان کے نئے وقف کر دی تھی۔

سامنے کی صف میں قورمہ بانٹتے ہوئے تقن میاں بڑے افسوس کے ساتھ اس المناک حادثہ پہ گفتگو کر رہے تھے کہ دلی رنگریز کا تعزیہ اس مرتبہ پھر مولا کنجڑے کے تعزیہ سے مار کھا گیا اور شدن نے یکا یک چونک کر کہا کہ ابے ہاں وہ تو گئی۔

کب؟ علمدار نے بے تاب ہو کر سوال کیا۔

اسی گاڑی سے ابھی ابھی ان کا اکہ لدا جا رہا تھا۔

شبر کا منہ کا نوالہ منہ میں رہ گیا۔ محسن سوچ رہا تھا کہ اس کے سامنے سے بریانی کا پلیٹ اور قورمہ کا پیالہ اٹھا لیا گیا تھا۔ علمدار گم صم بیٹھا تھا۔ کاظم کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی بیاض کے ورق بکھر کر فضا میں اڑتے پھر رہے ہیں اور شدن نے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ سالو مرے کیوں جا رہے ہو مولا نے چاہا تو اگلے برس پھر آئے گی۔

◆◆◆

عقیلہ خالا

دو دن تک تو خیریت رہی لیکن تیسرے دن سارے محلہ میں بات اڑ گئی کہ تحصیلدارنی کے بیٹے کی منگنی نمبردارنی کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔ نمبردارنی بیچاری، بہت جز بز ہوئیں کہنے لگیں کہ بیبیو خدا کے غضب سے ڈرو تمارے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔ پھر بھی انہوں نے اس افواہ کی کچھ ایسے زیادہ زور شور سے تردید نہیں کی لیکن تحصیلدارنی کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تو بکھری بکھری پھرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ جس بی بی نے میرے لونڈے کا نام لیا ہے اس کی سات پشتوں کو نہیں چھوڑوں گی۔ لو بھلا میں کسی کے اچھے میں نہ برے میں کمبختی ماریاں میرا کیوں ذکر کریں ہیں جن جن بیبیوں پہ تحصیلدارنی کو شبہ تھا۔ انہوں نے آ کر خوب خوب صفائیاں پیش کیں آپا رقیہ نے اپنی صفائی میں بہت کوس کٹائی کی اور کہا کہ جس رنڈی نے میرا نام لیا اس کی کوکھ میں کیڑے پڑیں۔ مجھ کال کھاتی نے تو بس اتنا کہا تھا کہ اللہ رکھواب تو نمبردارنی کی لونڈیا سیانی ہوگئی ہے کہیں اس کی ابھی لگی لگائی نہیں ہے میری زبان گل جائے جو میں نے تمہارے بیٹے کا نام بھی لیا ہو۔

دان پوروالی کا انداز نرم تھا۔ توبہ توبہ ہونٹوں کی نکلی کوٹھوں چڑھی میں نے تو بس اتنا کہا تھا کہ نمبردارنی بڑی خاطر کی آدمی ہیں۔ بے چاریاں تحصیلدارنی کی خاطر میں بچھی جا رہی ہیں میں تو یہ کہہ کے ٹھگ ماری بن گئی۔ قسم لے لو جو میں نے اور کسی بات کا اشارہ بھی کیا ہو؟

عقیلا خالا کے سامنے تو کچھ کہنے کی کسے مجال تھی لیکن کسی نہ کسی طرح ان کے کان میں یہ بھنک پڑ ہی گئی کہ ان کا نام معرض بحث میں آگیا ہے بس بگڑ گئیں وہ تو دفاع بھی جارحانہ انداز میں کرتی تھیں۔ ایک ساتھ آگ بگولا ہو گئیں اور چلانے لگیں جس بذات نے مجھ پہ یہ طوفان باندھا ہے اس کے چونڈے میں آگ لگا دوں گی۔ تھی کون وہ میرا نام لینے والی۔ ذرا میرے سامنے تو آئے لچی کی ٹانگیں جھاڑ دوں گی اور پھر انہوں نے پینترا بدلا خدا بچائے یہاں کی بیبیوں سے لو پوچھو اتنے دنوں میں تو تحصیلدارنی پردیس سے اپنے گھر آئی ہیں آتے دیر نہیں ہوئی چٹے طوفان بندھنے شروع ہو گئے۔ نا بی بی یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں اے بس آدمی منہ چھپائے پردیس میں پڑا رہے غرض عقیلا خالا نے تو آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ اب اتنے بال کس کے سر میں تھے جو کہتا کہ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے خود تحصیلدارنی کے پاس اس بات کے شواہد موجود تھے کہ اس فتنہ کی جڑ عقیلا خالا ہیں لیکن انہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ بات کو گول رکھا جائے عقیلا خالا کی ہنگامہ آرائی سے وہ بیچاری اس قدر مرعوب ہوئیں کہ اب وہ خود جارحانہ انداز چھوڑ کر مدافعت پہ اتر

آئیں اور لگیں صفائیاں پیش کرنے لیکن عقیلا خالا یوں بخشنے والی کب تھیں۔ اب انہوں نے چندرا چندرا کر باتیں کرنی شروع کیں۔ نگوڑا شادی بیاہ بھی ہوجائے گا مگر ذرا آرام تو لینے دو۔

تحصیلدارنی بولیں بی بی مجھے تو ابھی اس کے بیاہ کا سان گمان بھی نہیں ہے ابھی اس کی ایسی عمر ہی کیا ہے۔

لیکن عقیلا خالا بھی بلا کی بنی ہوئی تھیں انہوں نے ذرا پہلو بدل کر کہا اور پھر عمر کے علاوہ اس کی تو ٹھیکرے کی منگنی ہے۔

اس بات پر تحصیلدارنی بہت گھٹیں لیکن کیا کرتیں جیسے تیسے کر کے انہوں نے بات بدلی اجی ابھی تو لونڈا خود تیار نہیں ہے۔ وہ آگے پڑھنے کو کہوے ہے۔ بھئی صاف بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی کئی سال شادی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خود تحصیلدارنی کی نیت کچھ بگڑ رہی تھی ان کے بیٹے کی بچپن کی منگنی تو ان کے جیٹھ کی لڑکی سے تھی لیکن وہ زمانہ وہ تھا جب تحصیلدارنی، تحصیلدارنی نہ ہوئی تھیں اور تحصیلدار صاحب کی والدہ زندہ تھیں۔ تھوڑے دن کی چھوٹائی بڑائی تھی جسے وہ خاطر میں نہیں لائیں اور جب لڑکا پیدا ہوا تو انہوں نے ٹھیکرے میں روپیہ ڈال کر اس منگنی کا اعلان کر دیا لیکن اب وقت بدل چکا تھا۔ تحصیلدار صاحب کی والدہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کی بیوی نے بہو کی حیثیت کو چھوڑ کر تحصیلدارنی کا مرتبہ حاصل کر لیا اور اس ٹھیکرے کا روپیہ اب کچھ زنگ آلود ہو چلا تھا۔ ادھر نمبردارنی کو اپنی جوان بیٹی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ تحصیلدارنی کو لپکنے کی انہوں نے جان توڑ کوشش کی لیکن عقیلا خالا نے ان کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ تحصیلدارنی ابھی شیشہ میں نہیں اتری تھیں کہ بات نکل گئی بس پھر کیا تھا۔ تحصیلدارنی بدک گئیں۔

عقیلا خالا نے اس طرح نہ معلوم کتنی مرتبہ کس کس کی کوششوں پر پانی پھیرا تھا۔ نمبردارنی نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط برتی تھی لیکن عقیلا خالا تو اڑتی چڑیا پکڑتی تھیں۔ خدا کو عقل سے پہچاننے والے اور بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا تھا۔ انہیں اور کام تھا بھی کیا ٹھالی ٹھسکی تھیں۔ اچھی میاں کو ڈھب پہ لانے کی بہت کوشش کی مشتری رنڈی سے ان کا دل پھیرنے کے لئے انہوں نے کیا کیا جتن نہیں کئے ٹونے ٹوٹکے کئے تعویذ باندھے۔ وظیفے پڑھے منتیں مانیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے چالیس دن کا چلہ کیا روز آدھی رات کو اٹھ کر کالے آموں والے باغ کی مسجد پہنچتی تھیں اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر وظیفہ پڑھتی تھیں۔ پھر انہوں نے درگاہ شاہ ولایت والے پیر میاں کی ہدایت کے مطابق ایک اور عمل شروع کیا۔ روز آٹے کی چالیس گولیاں پڑھ کر بطخوں کو چالیس دن تک کھلاتی رہیں شب برات پہ بارھویں امام کی خدمت میں عریضہ بھیجنا تو خیر ان کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا ہر سال بڑے اہتمام سے آٹے کے گولے میں اپنا عریضہ لپیٹتی تھیں اور پندرہ شعبان کو صبح پو پھٹنے سے پہلے پہلے چھوپے پہ پہنچتی اور اس یقین کے ساتھ اپنا

گولہ ڈالتی تھیں کہ اس مرتبہ یہ گولہ ضرور کسی نیک بخت مچھلی کے ہاتھ پڑے گا اور وہ ضرور اسے کسی فرشتے کی وساطت سے امام آخر الزمان کی خدمت میں پیش کردے گی۔ محرم کے زمانے میں ہر مرتبہ نویں شب کو بڑے علم کا پٹکا پکڑ پکڑ کے اور زار و قطار رو رو کر دعا مانگتی تھیں۔ حضرت عباس کو بی بی سکینہ کی پیاس کا واسطہ دے کر انہوں نے چاندی کی مشک چڑھانے کی منت بھی مانی تھی۔ خیر بڑے علم پہ تو حضرت عباس کے جلال سے مرعوب ہو جاتی تھیں۔ لیکن حضرت قاسم کی تربت پہ انہوں نے مہندی کی منت کے ساتھ ساتھ انہیں یہ دھونس بھی دے دی تھی کہ اگر میرا میاں مجھے نہ ملا تو اگلے سال چھوٹے شہزادے کے سہرے کی لڑیاں پکڑ کے بیٹھ جاؤں گی۔ تربت اور بڑے علم پہ معجزے کب کب نہیں ہوئے۔ لیکن عقیلا خالا کا تو مقدر ہی پھوٹا ہوا تھا سب تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ بیماری دل کا علاج نہ ہونا تھا نہ ہوا اور عقیلا خالا کو یقین ہو گیا کہ اچھن میاں کو ضرور رنڈی نے الو کا گوشت کھلا دیا ہے ورنہ وہ ایسے تو نہ تھے کہ ایک بیسوا کے ہاتھوں الو بن جاتے۔

ایک روز بات بڑھ گئی۔ اچھن میاں تو خیر فوں فاں رہتے ہی تھے لیکن عقیلا خالا بھی کب اپنی ناک پہ مکھی بیٹھنے دیتی تھیں۔ اچھن میاں نے ایک کہی تو انہوں نے ستر سنائیں خیر وہ تو زبان کی پھوہڑ تھیں ہی لیکن اچھن میاں نے بھی غضب کیا عورت ذات پہ ہاتھ اٹھایا پھر تو عقیلا خالا نے اپنا آپا پیٹ ڈالا اور بال آخر اعلان کر ڈالا کہ "نگوڑا خصم دل کا زخم۔" اور ڈول کرا کے ڈنکے کی چوٹ میکے چلی آئی۔ اس وقت عقیلا خالا کی بو جی زندہ تھیں۔ انہوں نے انہیں بہت سمجھایا بجھایا کہنے لگیں کہ بیٹی شریفوں میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔ ایک دفعہ جس کے ساتھ دامن بندھ گیا بندھ گیا۔ غصہ والا ہو شرابی کبابی ہو نیک بخت عورتیں سب کو بھر لیتی ہیں۔ مردوں سے بھی کہیں تیہا کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی بات میں زیادہ زور اور اثر پیدا کرنے کی خاطر خود اپنی مثال پیش کی۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کیسے جلالی تھے ذرا سی بات پہ گھر کے برتن باہر پھوڑتے تھے۔ گھر بار سے تو انہوں نے کبھی غرض رکھی ہی نہیں۔ روٹی کھانے اندر آتے تھے اور گلی باہر جا کر کرتے تھے لیکن کیا مجال کہ میں نے کبھی دم مارا ہو۔ ساری زندگی رو رو کے تیر کر دی۔

لیکن عقیلا خالا تو غصہ سے باؤلی ہو رہی تھیں تنک کے بولیں جی بو جی بس رہنے دو۔ میرا اس مردوئے سے نبھاؤ نہیں ہوگا۔ آگے کچھ کہا ہوگا تو بس تم ہی جانو گی۔

بو جی کو بھی ایک ذرا تاؤ آیا۔ اے لو غضب خدا کا بیٹی کا گھر اجڑ رہا ہے اور میں ٹک ٹک دیکھا کروں۔ میں اپنی زبان ہی کر نہیں بیٹھ سکتی۔ سمجھانا ہمارا کام ہے باقی تم جانو۔ عقیلا خالا اور بھڑکیں بڑا آیا ہے گھر میں تو اس گھر کا گھر وا کر دوں گی۔ جب گھر والا ہی اپنا نہیں ہے تو پھر گھر جائے چولہے میں بھٹی میں۔

اب بو جی نے دوسرا داؤں مارا "بیٹی ماں کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ لوگ آ آ کے میرے جنم میں تھوکیں گے اور کہیں گے کہ کیسی بیٹی جنی تھی"

لیکن عقیلا خالا کب اڑنگے میں آنے والی تھیں۔ بولیں "لوگ جائیں بھاڑ میں۔ مجھ سے جیتے جی دوزخ میں نہیں پڑا جاتا" بیٹی دودھ دیتی گائے کی دولاتیں بھی سہار لیوے ہیں۔ اس مرتبہ بو جی نے بالکل ایک نئے پہلو سے وار کیا تھا۔ لیکن عقیلا خالا نے ان کی مادی قدروں پہ ایمان لانے سے قطعی انکار کر دیا۔ نا بابا میرے بس کا یہ نہیں ہے۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

عقیلا تو نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے دوسروں کی دی ہوئی روٹی میں عزت نہیں اے۔ شوہر اگر سات جوتے لگا کے بھی روٹی دے تو وہ سونے کا نوالہ ہے۔ بو جی نے اپنے خاص اقتصادی نقطہ نظر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اس میں اخلاقیات کا رنگ پیدا کر لیا تھا۔

لیکن عقیلا خالا ایسے رزق کو جس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں آئے گا کتا پائے گا ٹکا۔ ایسی روٹی پہ خاک پڑ جائے۔ اور پھر انہوں نے یکا یک پینترا بدل کے بو جی پہ بھرپور وار کر ڈالا اجی تم کیوں دبلی ہوئی جا رہی ہو بندی بھیک مانگے کی محنت مزدوری کرے گی تمہارے سر نہیں پڑے گی۔

بو جی اس داؤں پہ تو چاروں شانے چت گریں۔ اپنی محبت جتاتے جتاتے ان کا دل بھر آیا اور عقیلا خالا کو سینے سے لگا کر وہ خوب پھوٹ پھوٹ کے روئیں اور اسی جذباتی افراتفری کے عالم میں انہوں نے اعلان کر ڈالا کہ مٹے اچھن میاں نے سمجھا کیا ہے باپ مر گیا ہے لیکن خدا سے توبہ توبہ کر کے کہتی ہوں کہ گھر میں روٹیوں کا ٹوٹا نہیں اے۔ میں تو اب بچی کو اس کی ڈیوڑھی پہ قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی۔ قصہ مختصر عقیلا خالا شوہر سے چھٹ گے میکے بیٹھ گئیں یوں وہ بو جی کے سامنے بھی کب دبتی تھیں لیکن تھوڑی سی روک ٹوک تو رہتی ہی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد تو انہیں آزادی کی سند مل گئی۔ خود کیا چھٹ کے بیٹھیں دوسروں کی منگنیاں تڑوانے اور بیاہ شادیوں میں کھنڈت ڈالنے کا انہوں نے وطیرہ اختیار کر لیا۔ اس کی بات اس سے لگائی فلاں کے بیٹے کو بدنام کیا۔ فلاں کی بیٹی میں فی نکالی۔ یوں وہ بیبیوں میں آپس میں جوتا چلواتی رہتی تھیں۔ اس معاملہ میں ان کی قیافہ شناسی کو داد دینی پڑے گی۔ ویسے انہوں نے کنسوئیاں لینے کو اپنے اوپر حرام نہیں کیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے خط کا مضمون ہمیشہ لفافہ دیکھ کر بھانپا اور جب کبھی اپنی استادی دکھانے پہ آتی تھیں تو ہیر پھیر سے باتیں کر کے خود بات والی سے بات اگلوا لیتی تھیں۔ بتول بھابی نے اپنی بیٹی کے پیاموں کے معاملہ میں بڑی رازداری برتی تھی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی لیکن بشیرن اور بتول بھابی کے ملنے کے انداز میں عقیلا خالا کو کچھ ایسی

پراسراریت نظر آئی جو منگنی بیاہ کے معاملات سے مخصوص ہے۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے لڑکی میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ایک روز آپا رقیہ کے یہاں بھری بیبیوں میں انہوں نے یہ ہیجان انگیز انکشاف کیا کہ بتول بھابی کی لونڈیا تمباکو کھاوے ہے۔

اس اطلاع سے ساری بیبیوں میں سنسنی پھیل گئی اور بیچاری بشیرن کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آپا رقیہ مجسم استفہامیہ علامت بن گئی اور بولیں سچ کہو عقیلا خالا۔

اے تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی میں تو بتول بھابی کے جب بھی گئی میں نے یہی دیکھا کہ لونڈیا کے آگے پاندان کھلا رکھا ہے اور منہ بکری کی طرح چل رہا ہے۔

اے ہے۔ ماں منع بھی نہ کرتی۔ رامپور والی نے تازہ تازہ چبائے ہوئے پان کی پیک تھوکیئے کہا اب یہ تیسرا پان آپا رقیہ نے انہیں لگا کر دیا تھا۔

ماں دکھیا کیا کرے۔ عقیلا خالا دراصل الزام کا بٹوارہ نہیں چاہتی تھیں۔ لڑکی کا دیدہ پھٹا ہوا ہے۔ پان وہ کھاتی ہے مسی وہ لگاتی ہے اور ابھی سے وہ ڈھیلا جامہ بھی پہنے ہے۔

کنوار پت میں یہ حال ہے تو بیاہ کے بعد تو جنے کیا ستم ڈھائے گی۔ آپا رقیہ نے حاضر کو چھوڑ کر مستقبل کے امکانات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

سانس کا چونڈا مونڈے گی۔ عقیلا خالا کا جواب مختصر تھا لیکن بہت بے ساختہ۔ بس تو خصم کی ساری کمائی پان دان کی راہ اڑے گی۔ رامپور والی اخلاقیات کی بحث سے نکل کر مسئلہ کو اقتصادی نقطہ نظر سے جانچنے پہ مائل تھی۔

اجی کوئی ہزاری دولہا ملے گا۔ جب ہی پاٹا باندھے گا عقیلا خالا نے اس وقت براہ راست بشیرن کی طرف رخ کر لیا تھا۔ بشیرن نے اس پوری بحث میں بس ظاہرداری کے طور پر ہوں۔ ہاں کر کے حصہ لیا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے کا رنگ بار بار بدلتا تھا غیب کا حال تو اللہ جانے لیکن یہ سب نے دیکھا کہ اس روز سے بتول بھابھی کے یہاں بشیرن کا آنا جانا ترک ہو گیا اور محفلوں میں وہ ایک دوسرے سے کچھ کترانے لگیں۔

بتول بھابی کی بیٹی کا معاملہ تو خیر ابھی پکنے کہاں پایا تھا۔ بس مذاکرات ہو رہے تھے۔ عقیلا خالا نے بیچ میں بھانجی ماردی لیکن انہوں نے تو بڑے بڑے پختہ رشتوں کو اپنی استادی سے تڑوا دیا تھا۔ حویلی والی کی بیٹی کے بیاہ کی تو تاریخ تک ٹھہر گئی تھی کمال یہ ہے کہ حویلی والی اپنی بیٹی کی کمسنی کا بہت پروپیگنڈہ کیا کرتی تھی اور عقیلا خالا نے اسے اسی عمر کے داؤں پہ لا کے دے مارا۔ منگنی کی رسم

ادا ہوگئی۔ بیاہ کی تاریخیں ٹھہر گئیں حویلی والی بہت زور وشور سے جہیز کی تیاری میں مصروف تھی۔ ادھر احسان علی کے یہاں دن رات جوڑے بیڑے تیار ہو رہے تھے۔ لیکن جب وہ دعوت ولیمہ کے لئے کھانے کی فہرست تیار کرنے بیٹھے تو عقیلا خالا نے ٹنگوی ماردی۔ احسان علی نے طے کیا تھا کہ نان قورمہ شیر مال اور بریانی کی بجائے اور میٹھے میں مزعفر اور فیرنی ہو لیکن عقیلا خالا بھی بڑی ہفت رنگن تھیں۔ بولیں کہ اجی دودھ ڈبل روٹی بھی ہونی چاہئے۔

احسان علی بہت ٹپٹائے آخر دودھ ڈبل روٹی کی کیا تک ہے۔

عقیلا خالا پڑاق سے جواب دیا۔ اے لو تک کیسے نہیں اے۔ دلہن پر کیا کھائے گی۔ اب وہ کوئی تمہارے شیر مال اور نان قورمے کے لئے دانت بنوا کے تھوڑا ہی لائے گی۔ اس ایک فقرے نے وہ قیامت ڈھائی کہ ساری بنی بنائی عمارت اڑا اڑا دھم کر کے نیچے آگری۔ اسی طرح انہوں نے سید عاشق علی کے بیٹے کے بیاہ میں کھنڈات ڈالی تھی۔ اچھی خاصی شادی طے ہوگئی تھی۔ بیٹی والے لڑکے کی عمر سے بے خبر نہ تھے لیکن انہیں عمر کی زیادتی کا کچھ ایسا زیادہ شعور نہ تھا۔ عقیلا خالا کے دم کو دعا دیجئے کہ انہوں نے جہیز کے سامان میں ڈخضاب کا سوال اٹھا کر سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔

یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ عقیلا خالا پیام وسلام کے ہنگامے میں ہی اقدام کرتیں وہ حفظ ماتقدم کے طور پر بات پڑنے سے پہلے بھی لڑکی کو بدنام کر دیا کرتی تھیں ذرا کوئی شوشہ مل جاتا بس پھر کیا تھا بات کا بتنگڑ بناتی دیتی تھیں چھموں کی بیٹی میں اور کیا عیب تھا بس اک ذرا دبلی پتلی تھی۔ عقیلا خالا کے ذہن میں ایک روز یکایک یہ نکتہ وارد ہوا کہ اسے ضرور کوئی روگ لگ گیا ہے۔ ان کے پیٹ میں بات رکتی تھوڑا ہی تھی۔ انہوں نے جھٹ آپا رقیہ کے سامنے بات چھیڑ دی کہنے لگیں۔

اے آپا رقیہ یہ چھموں والی کو کیا ہوا جا رہا ہے۔ بالکل جھلنگا ہوگئی ہے۔ آپا رقیہ کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ بات پتہ کی تھی دل کو لگ گئی۔

کہنے لگیں۔ اری تو کیوے تو سچ ہے۔ اجی ہم نے دبلی پتلی لونڈیاں بھی دیکھی ہیں مگر وہ تو سوکھ کے کانٹا ہوگئی ہے اور صورت دیکھو زردی پتی ہوئی ہے۔

اجی میں تو جانوں اسے کوئی روگ لگ گیا اے آپا رقیہ نے عقیلا خالا کی ہمت بڑھا دی تھی۔ انہوں نے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

اجی کوئی روگ ہے تو علاج کرائیں بھلا بیمار لڑکی کو کون بیاہنے آئے گا آپا رقیہ تو بس شادی کو بنیادی مسئلہ سمجھتی تھیں۔

چھموں دودھ پیتی بچی تھوڑا ہی ہے وہ یہ بات نہیں جانتی ہے۔ ایسا بھی کیا ہے کہ علاج نہ کرا رہی ہو۔

دانپوروالی اب تک بہت سکون اور سنجیدگی سے یہ سب کچھ سنتی رہی تھی لیکن عقیلا خالا کی اس بات کے بعد اس کے لئے بھی بولنے کی گنجائش پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی بات بہت ہاتھ پیر بچا کے بڑی احتیاط سے کہی۔ اجیعقیلا خالا تمہیں خبر ہے یہ پچھلے پندھواڑے میں چھموں بیٹی کو لے کر علی گڑھ کیوں گئی تھی۔

اس پہ عقیلا خالا اور آپا رقیہ دونوں بہت چونکیں۔ کچھ دیر تک تو تینوں کو یہ کرید رہی کہ آخر چھموں کے اس طرح علی گڑھ جانے میں کیا بھید ہے لیکن پھر یکایک عقیلا خالا کو یاد آیا کہ علی گڑھ میں مس صاحب کا شفاخانہ ہے اور جب انہوں نے اس معلومات کا اظہار کیا تو دانپوروالی اور آپا رقیہ دونوں نے سناٹے میں آگئیں دوسرے دن سارے محلہ میں اس بات کا چرچا تھا کہ چھموں کی بیٹی کو کوئی روگ لگ گیا ہے اور چھموں علی گڑھ کی مس صاحب سے اس کا علاج کرا رہی ہے۔

لیکن اس گفتگو سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ عقیلا خالا محض تخریب کی قائل تھیں تعمیری کاموں میں بھی ان کا ذہن خوب چلتا تھا یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے کام بگاڑے زیادہ تھے اور بنائے کم تھے وہ زبان کی پھوہڑ ضرور تھیں۔ دل کی بری نہ تھیں۔ دوسرے کو مصیبت میں دیکھ کر تو وہ فوراً پگھل جاتی تھیں۔ جب بندو نے اپنی بیوی کچی چٹیا پکڑ کے گھر سے نکال دیا تھا۔ تو اکیلی عقیلا خالا ہی تھیں جنہیں اس پہ رحم آیا تھا۔ باقی سارے محلہ نے اس واقعہ کو خوب بانس پہ چڑھایا اور خوب ادھر کی باتیں ادھر لگائیں لیکن عقیلا خالا موم ہوگئیں۔ جس کی دنیا دشمن بن جائے عقیلا خالا اس کی دوست بن جاتی تھیں۔ وہ پہلے خود ہنسنا شروع کرتی تھیں۔ لیکن جب سب ہنسنا شروع کردیتے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے وہ بندو کی بیوی کو خود اس کے گھر پہنچا کے آئیں۔ انہوں نے بندو کو کچھ ڈانٹ پلائی اور کچھ پچکارا اور ذرا سی دیر میں رام کرلیا۔ دانپوروالی کے گھر میں جب رن پڑتا تھا تو تماشائیوں کی صف سے بال آخر عقیلا خالا ہی ٹوٹ کر جاتی تھیں اور ساس بہو میں سمجھوتہ کراتی تھیں۔ دانپوروالی اور اس کی بہو میں دو دو چونچیں تو خیر روز ہی ہوتی تھیں لیکن مہینہ پندھواڑے میں ایک گھمسان کا رن بھی پڑ جاتا تھا۔ سارا محلہ تماشہ دیکھنے ٹوٹتا تھا شروع شروع میں عقیلا خالا بھی تماشائیوں کی صف میں نظر آتی تھیں لیکن جب لڑائی میں کوس کٹائی سے آگے کی منزل آتی تھی تو پھر ان کی رگ رفاقت پھڑکتی اور چیختی چلاتی بیچ میں کود پڑتیں۔

اے تم ساس بہوؤں کی شرم وحیا بالکل اڑ گئی۔ ساری برادری تھوتھو کر رہی ہے کچھ تو شرم کرو۔ برادری کو دیکھ کے تو ڈوبانٹ بھی بانس سے اتر آوے ہے تم تو نٹ سے بھی بدتر ہوگئیں۔ پھر وہ مخصوص طور پر دانپوروالی سے خطاب کرتیں اے دانپوروالی تو بھی آفت کی پڑیا ہے بہو کو کسی کل چلن نہیں لینے دیتی۔ پھر وہ دانپوروالی کی بہو پہ حملہ آور ہوتیں۔ اری بہو ذرا تو ہی چھوٹی بن جا آخر کو یہ تیری ساس

ہے سا سیں کہہ سن لیا بھی کرے ہیں۔ لیکن ایسی حرافہ بہوئیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں۔ اور یوں ڈانٹ ڈپٹ کر وہ جھگڑا رفع دفع کر دیا کرتی تھیں۔

اس قسم کے چھوٹے بڑے احسانات وہ محلہ کی بہت سی بیبیوں پہ کر چکی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عقیلا خالا کی اگر بارہ گز کی زبان نہ ہوتی تو وہ لاکھ روپے کی آدمی تھیں۔ لیکن کفران نعمت کرنا ان سے نہ آتا تھا۔ اللہ میاں نے جیسی زبان انہیں بخشی تھی اس کا شکر یہ وہ ہمیشہ عملاً ادا کرتی رہیں پھر وہ یہ چاہتی تھیں کہ محلہ میں رونق رہے اب یہ عقیدے کی بات ہے کہ وہ گھر کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف سمجھتی تھیں محلہ میں جس زمانہ میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا تھا تو انہیں خفقان ہونے لگتا تھا گھر میں کون سی دلچسپی تھی جوان کا پاؤں نکلتا۔ کھانا ہضم کرنے کے لئے آپا رقیہ کے یہاں جانا ضرور تھا اور آپا رقیہ کے یہاں جا کر محض پان کھالینا انہیں بے معنی نظر آتا تھا آخر وہ ایسی پان کی بھوکی تو نہیں تھیں کہ محض اس کی خاطر وہ ان کے یہاں جاتیں یوں بھی پان کا اس وقت تک مزہ نہیں آتا جب تک اس کے ساتھ گرما گرم باتیں نہ کی جائیں۔ پاندان اور سروتے کی آواز باتوں کے طوفان میں جادو جگاتی ہے پھر باتوں باتوں میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ باتیں تو گیہوں کی مہنگائی اور پیٹ کی بدہضمی کے متعلق بھی کی جاسکتی ہیں لیکن باتوں کا اعلیٰ مذاق رکھنے والوں کو ان باتوں میں کب مزہ آتا ہے۔ انہیں تو بے بات کا چسکا لگا ہوتا ہے۔ عقیلا خالا کے مذاق کی تسکین اس وقت تک نہیں ہوتی تھی۔ جب تک کسی کی منگنی بیاہ کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اب چونکہ منگنی بیاہ کے ذکر میں کسی کی رسوائی کا پہلو پیدا نہ ہو تو پھر وہ کچھ سیٹھا سیٹھا سا رہتا ہے۔ اس لئے اگر عقیلا خالا کی باتوں سے کچھ بیٹی والوں کی رسوائی ہوگئی تھی اور چند شادیوں کے رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا تو میں اس میں عقیلا خالا کی کیا خطا۔ وہ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ ویسے جس قصے میں انہیں شریک کر لیا جاتا تھا۔ اس میں وہ بڑے جوش و خروش اور بڑے خلوص سے کام کرتی تھیں۔ جہاں پیام ان کی وساطت سے آئے گویا پتھر کی لکیر بن گئے نمبردارنی بھی کچھ اس قسم کی باتیں سوچ کر چپ ہو رہیں۔ ورنہ شروع میں تو انہیں بہت تاؤ آیا تھا پھر انہیں یہ احساس بھی تو تھا کہ ان کے آگے جوان بیٹی ہے اور جوان بیٹی کی ماں کو بہر حال جھکنا پڑتا ہے۔ پہلے تو وہ عقیلا خالا سے کھنچی کھنچی سی رہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ خاص طور پر ان کی طرف کھینچنے لگیں اور ایک زمانہ وہ آیا کہ نمبردارنی عقیلا خالا کے نام کی مالا جپتی تھیں اور عقیلا خالا ہر مجمع میں بیٹھ کر نمبردارنی کی بیٹی کی تعریفوں کے پل باندھتی تھیں۔ عقیلا خالا کی یہ روش کسی پچھتاوے کا نتیجہ نہ تھی پچھتاوا تو انہیں اس وقت ہوتا جب انہیں یہ یاد رہتا کہ وہ کوئی ستم ڈھا چکی ہیں پچھلی باتوں کو یاد رکھنے کا نٹا عقیلا خالا نے کبھی نہیں پالا نہ کبھی آئندہ کے متعلق منصوبے باندھنے کی تکلیف انہوں نے گوارا کی۔ انہیں تو تنت وقت پہ الہام ہوتا تھا اور اس الہامی کی کیفیت میں جو جی چاہتا تھا کر گزرتی تھیں۔ ماضی ان کی نظر میں محض جھمیلا ہوتا تھا مستقبل کو انہوں نے

ہمیشہ گھپلا سمجھا۔ وہ تو بس حاضر میں جیتی تھیں۔ فکر فردا سے آزاد۔ غم دوش سے بری۔ ان کے لئے تو بس موجود لمحہ سب کچھ تھا۔ نمبر دارنی سے جب ان کی گاڑھی چھننے لگی تو انہیں یہ احساس ہو چلا کہ نمبر دارنی کی بیٹی سیانی ہوگئی ہے اور سیانی بیٹی کا ماں کے گھر بیٹھے رہنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے جس طرح بھی ہو اس کا گھر جلد آباد ہو جانا چاہئے اور جتنا ان کا یہ احساس شدید ہوتا گیا۔ اتنا ہی تحصیلدارنی کے یہاں ان کا آنا جانا بڑھتا گیا۔ نمبر دارنی نے عقیلا خالا سے یارانہ گانٹھا تھا اور عقیلا خالا نے تحصیلدارنی کی للو چپو کرنی شروع کر دی یوں نمبر دارنی اور تحصیلدارنی کے درمیان ایک پل قائم ہو گیا۔ تحصیلدارنی کو شیشہ میں اتار لینا بس کچھ عقیلا خالا کا ہی کام تھا۔ بیٹے والی کا دماغ یوں بھی عرش پر رہتا ہے اور جب وہ ایک مرتبہ کسی لڑکی سے بدک جائے تو پھر تو اسے رام کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن عقیلا خالا بھی اپنے وقت کی ڈاکٹر گوئبلز تھیں۔ جب بھی وہ تحصیلدارنی کے یہاں جاتی تھیں کسی نہ کسی تقریب سے نمبر دارنی کی بیٹی کی تعریف کر ہی دیتی تھیں۔ کبھی ڈھکی چھپی کبھی برملا۔ کھانے پکانے کا ذکر نکل آتا تو کہتی تھیں اجی ہنڈیا گھر سے نہیں بنتی وہ تو کچھ بعضوں کے ہاتھ کی ہنڈیا ہوتی ہی ہے مزیدار اب اللہ رکھو نمبر دارنی والی ہے۔ ایسی ہنڈیا پکاوے ہے کہ بس انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ اور اس کے ہاتھ کے پکوان کی تو خیر کیا ہی بات ہے ورقی سموسے تو ایسے بناوے ہے کہ بزار کے بھی کیا ہوں گے ہونٹوں سے پھوٹے ہیں عید کے استقبال میں جب تحصیلدارنی کے یہاں بچوں کے کپڑے سلنے لگے تو عقیلا خالا نے دوسرے پہلو سے اعصابی جنگ شروع کی۔ انہوں نے مختلف اوقات میں کپڑوں کی سلائی کی سائنس پہ بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ بنیادی چیز کپڑے کا بیونت ہے اگر کپڑا کٹا اچھا نہیں ہے تو کیسا ہی بڑھیا ہو کتنی ہی نفاست سے سیا گیا ہو کبھی اچھا لباس تیار نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے نمبر دارنی کی بیٹی کے تیار کئے ہوئے کپڑوں کے حوالے دے دے کر یہ بھی ثابت کیا تھا کہ کپڑا تو بس نمبر دارنی والی بیونتے ہے خدا اسے نظر بد سے بچائے۔ اس کا سیا ہوا کپڑا ایسا فٹ آوے ہے کہ بس ورزی کو بھی مات کرتا ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا تھا کہ تحصیلدارنی کو اپنے بیٹے کی شادی جلدی کر لینی چاہئے کہ دلہن کے آگے بار سنبھال لے۔ جب وہ تحصیلدارنی کو کپڑے سینے میں مصروف دیکھتیں تو کہنے لگتیں 'اجی اب تمہاری یہ عمر کہاں ہے کہ اکیلی سارے گھر کا دھندا کرو۔ لونڈے کا بیاہ کر ڈالو۔ اللہ رکھو سیانا بھی ہو گیا ہے اور تم اکیلی عورت کیا کیا کام دیکھو گی۔ بہو آ جائے گی تو سارا کام سنبھال لے گی۔'' عید کے دن جب تحصیلدارنی کے بیٹے نے انہیں عید کا سلام کیا تو انہوں نے اس کی چٹ چٹ بلائیں لیں اور دعا دینے لگیں جیتے رہو کڑوے نیم سے بڑے ہو۔ ماں باپ تمہاری بہاریں دیکھیں۔ اللہ کرے سہرے کے پھول جلدی کھلیں اور اس مقام پر آ کر ان کی دعا نے پیشین گوئی کی شکل اختیار کر لی۔ اللہ نے چاہا تو اگلے سال تحصیلدارنی صاحبہ چھپر کھٹ پہ بیٹھ کے حکم چلائیں گی اور شیر بنانے اور بانٹنے کا کام تمہاری بہو سنبھالے گی۔

تحصیلدارنی آخر آدمی تھیں۔ مار کھا گئیں۔ عقیلا خالا کی باتیں سن سن کر ایک تو انہیں یہ احساس ہو گیا کہ وہ واقعی اکیلی ہیں اور اس اکیلے پن کا علاج صرف بیٹے کی شادی ہے تاکہ بہو آ کے ان کا ہاتھ بٹائے۔ پھر وہ نمبردارنی کی بیٹی پہ بھی ریجھ گئی تھیں بال آخر ایک دن انہوں نے عقیلا خالا سے اپنے ارادے کا اظہار کر ہی دیا۔ عقیلا خالا نے ان کی نیت کو بہت سراہا' اجی تحصیلدارنی بڑی نیک بخت لونڈیا ہے ایسی بہو اور کہیں نہ ملے گی۔ تمہارے پاؤں دھو دھو کے پیئے گی اور میں ت جانوں نمبردارنی کو بھی اعتراض نہیں ہو گا اور کوئی اس کی لونڈیا کے لئے عرش کا تارا تھوڑا ہی اترے گا۔ اللہ رکھو لونڈا بھی لالوں میں کا لال ہے۔ غرض عقیلا خالا کی تگ ودو سے نمبردارنی کی بیٹی کی بات ٹھہر ہی گئی۔

نمبردارنی نے بہت دھوم دھام سے شادی کی۔ ایک بیٹی تھی اور انہیں دیکھنا ہی کیا تھا۔ خوب دل کی حسرتیں نکالیں۔ ٹھاٹ باٹ کا جہیز چڑھا۔ تاشے بجا ے بجے۔ آتش بازی چھوٹی۔ مجرے ہوئے رنڈیاں ناچیں' کھانا دانا ہوا۔ اس موقعہ پر عقیلا خالا نے نمبردارنی کا بہت ہاتھ بٹایا۔ بڑے قرینے سے انہوں نے انتظام کیا تھا۔ نمبردارنی تو جوش میں اشرفیاں لٹانے پہ تلی ہوئی تھیں لیکن عقیلا خالا نے کوکلوں پہ مہر لگائی اور دانے دانے پہ احتساب کیا دیگ پہ وہی بیٹھی تھیں۔ ایک دانہ بیران نہیں ہونے دیا۔ نائی' ڈوم' کڑ' کمین اور ایرا غیرا ان کی کفایت شعاری پہ بہت کڑھے لیکن وہ کسی ایک کو خاطر میں نہ لائیں۔ پاندان کے انتظام میں انہوں نے یہ اصول پیش نظر رکھا کہ بیڑوں کی تھالی مسلسل گردش میں ہے لیکن کوئی بی بی بکری کی طرح بے تحاشا چرائی نہ کرے۔ اس حسن انتظام پہ بیبیوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی۔ دانپوروالی سے چپ نہ رہا گیا اس نے کہہ ہی دیا کہ ڈوبے پان تو چاندی کے ورق بن گئے۔

بشیرن کے تخیل کو بھی مہمیز ہوئی بولی اجی سنا ہے کہ پانوں کا اب راشن ہو گیا ہے۔

عقیلا خالا کی حکومت میں تو کوکلوں پہ مہریں لگیں گی۔ چھموں نے راہ راست عقیلا خالا پہ حملہ کر دیا تھا۔

اب آپا رقیہ کے ہاتھ سے بھی صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ پھر بھی انہوں نے اختصار اور اختصار کے ساتھ ایک ذرا ابہام ضروری سمجھا بس انہوں نے اتنا کہا نئی نائن بانس کا نہنا خدا گنجے کو ناخن نہ دے جو گنج کھجائے۔ بتول بھائی کی طنز میں تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی عقیلا خالا سے ان کے کھٹنے کی معقول وجہ موجود تھی بشیرن کے یہاں ان کی تک اچھی خاصی لڑ گئی تھی۔ لیکنعقیلا خالا نے بھانجی مار دی۔ آج نمبردارنی کی بیٹی کی شادی میں ان کی طرف سے جس جوش وخروش کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا اس کو دیکھ کر بتول بھابی کے اور پتنگے لگ گئے۔ عقیلا خالا کو اپنے کام میں سدھ نہ تھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ رائے عامہ یکا یک ان کے خلاف ہو گئی ہے۔ بتول بھابی کو ایسا موقعہ خدا دے۔ انہوں نے طعن وتشنیع کر کر کے اپنے دل کا غبار خوب نکالا۔ انہوں نے صرف طنز وتمسخر پہ ہی قناعت نہیں کی وہ ایک اس سے بھی

بڑی حرکت کر بیٹھیں۔ مجرے کے لئے مشتری کو بلوایا گیا تھا۔ اچھن میاں کی عنایت سے مشتری کو ایک چاند سا بیٹا بھی مل گیا تھا جس کی عمر اب پانچ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ نائی کے لونڈے کے ساتھ وہ کہیں زنانے میں چلا آیا۔ بتول بھابی کے ذہن میں یکا یک ایک خیال وار ہوا۔ انہوں نے اس بچے کو بہت پچکارا عقیلا خالا اس وقت دالان میں پاندان پہ بیٹھی تھیں۔ ان کی طرف بتول بھابی نے چپکے سے اشارہ کر کے بچے کو سمجھا دیا کہ بیٹا انہیں سلام کر آ

توقع یہ تھی کہ اس حرکت پہ قیامت کھڑی ہو جائے گی۔ بیبیوں میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ طوفان کا انتظار تھا لیکن طوفان نہیں آیا۔ عقیلا خالا نے تین چار ڈھیلی ڈھالی گالیاں اور دو ڈھائی نیم گرم کو سنے دیئے اور چپ ہو رہیں۔ اس کے بعد پانوں کی جو تھالی آئی وہ عجب بے ڈھنگی تھی۔ چھالیا اور تمبا کو گڈ مڈ تھا۔ پانوں میں چونا اتنا تھا کہ جس نے پان کھایا زبان کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ آدھ گھنٹے بعد عقیلا خالا نے نمبردارنی کو نوٹس دے دیا کہ میں تو گھر چلی۔ نمبردارنی بیچاری سٹپٹا گئیں اے ہے مہمانوں سے گھر بھرا ہوا ہے۔ یہ بھلا کوئی وقت جانے کا ہے اور اب عقیلا خالا کو احساس ہوا کہ ان کے جانے کی کوئی وجہ بھی ضرور ہونی چاہئے انہوں نے فوراً عذر کیا۔

اجی دو دن دو راتیں ہوگئیں۔ ایک ٹانگ پھر رہی ہوں۔ میری کمر میں بری طرح درد ہو رہا ہے۔ اب تو مجھ سے بالکل نہیں بیٹھا جاتا۔

نمبردارنی کو یہ وسوسہ ستانے لگا کہ شاید کسی بات پر عقیلا خالا تنک گئی ہیں لیکن جب انہوں نے ان کی صورت دیکھی تو چہرے پر واقعی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور انہیں یقین ہوگیا کہ ضرور ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔

رات کو جب نائن کھانا لے کر عقیلا خالا کے یہاں گئی تو اس نے انہیں عجیب عالم میں پایا۔ لالٹین کی لو تیز تھی۔ آدھی چمنی دھوئیں سے رچ گئی تھی۔ عقیلا خالا الٹی لیٹی تھیں۔ نائن کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ان کا سارا چہرہ تمتمار ہا تھا آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں بالوں کی کئی لٹیں لال سرخ ہوئے رخساروں پر بکھر کر چپک گئی تھیں۔

یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ عقیلا خالا کی لالٹین کی لو کب تک تیز رہی اور کمر کے درد سے وہ کب تک چار پائی پہ کروٹیں بدلتی رہیں لیکن جب صبح کو وہ نمبردارنی کے یہاں پہنچیں تو بالکل تازہ دم تھیں ان کا کمر درد رفو چکر ہوگیا تھا اور بڑے طنطنہ سے وہ نائنوں کو کام کاج کرنے کی ہدایت دے رہی تھیں۔

◆◆◆

روپ نگر کی سواریاں

منشی رحمت علی حسب عادت منہ اندھیرے اکوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔اڈہ سنسان پڑا تھا۔چاروں طرف اکے ضرور نظر آتے تھے لیکن بے جتے ہوئے۔ان کے بموں کا رخ آسمان کی طرف تھا اور چھتریاں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔جا بجا کھونٹوں سے بندھے ہوئے گھوڑے یا تو اونگھ رہے تھے یا ایک الکساہٹ کے ساتھ اپنے آگے پڑی ہوئی گھاس چر رہے تھے۔البتہ پاس والے خشک تالاب کی گندی سیڑھیوں پر اینڈتے ہوئے بعض گدھے بہت بیدار نظر آئے تھے۔تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے رینکنے کا ایسا تار بندھتا تھا کہ ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔اس پورے ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ چمک رہی تھی۔وہ سامنے ڈاک خانے کے دروازے کے برابر والا سرخ لیٹر بکس تھا اس سے چار قدم پرے لالہ چھجومل کی کھچیوں والی دکان بند پڑی تھی لیکن اس کے چبوترے پر جنگلی کبوتروں کا ایک غول اتر آیا تھا۔یہ کبوتر اناج کے الم غلم دانے چگتے چگتے بار بار اس قدر قریب آجاتے کہ ان کا الگ الگ وجود ختم ہو جاتا اور زمین پر بس ایک سرمئی سایہ کپکپاتا نظر آتا۔کنوئیں کے قریب املی کے درخت کے نیچے چھدا اکے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا' دور سے وہ صورت تو نہیں پہچان سکا لیکن چال ڈھال اور حلیہ دیکھ کر اس نے تاڑ لیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ منشی رحمت علی ہیں اور جب ذرا قریب آئے تو چھدا نے آواز لگائی۔میاں چل رئے او۔

''ابے چلنا نہ ہوتا تو مجھے کیا باؤلے کتے نے کاٹا تھا جو صبح ہی صبح اڈے پر آتا؟''

تو بس میاں آجاؤ میں بھی تیار ہوں اب گھوڑا جوتتا۔

لیکن بھاؤ تاؤ کئے بغیر کوئی کام کرنا منشی رحمت علی کی وضعداری کے خلاف تھا یہ اور بات ہے کہ بہت چالاک بننے کی کوشش میں کبھی کبھی وہ چوٹ بھی کھا جاتے تھے۔بہر حال وہ تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔آگے اللہ میاں کی مرضی۔چھدا کا پہلا وار تو خالی گیا اب اس نے دوسری چال چلی اجی منشی جی تم سے زیادہ تھوڑائی لوں گا بس اٹھنی دے دیکھو۔بھیا میرا تیرا سودا نہیں پٹے گا۔منشی رحمت علی نے قطعی طور پر اپنی نارضامندی کا اعلان کر دیا۔انہوں نے اپنا رخ سامنے والے نانبائی کی دکان کی طرف کر لیا تھا۔

لیکن چھدا نے انہیں جاتے جاتے پھر روک لیا۔تو میاں تم کیا دو گے؟

منشی رحمت علی نے بات دونی سے شروع کی اور بال آخر تین آنے پہ ٹک گئے۔انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کان کھول کے

سن لے تین آنے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دوں گا۔ چھدا نے بھی قطعی جواب دے دیا۔ اجی میاں تین آنے تو نہیں لوں گا اور جب وہ جانے لگے تو چھدا نے چلتے چلاتے ایک ٹکڑا اور لگا دیا۔ ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ تین آنے میں کون سا اکے والا منشی جی کو روپ نگر پہنچا دے گا۔

لیکن منشی رحمت علی آج کا چھدا کا ہر وار خالی دینے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ بات بھی سنی ان سنی کر دی اور نانبائی کی دکان کی طرف چل پڑے۔ دور سے ہی انہوں نے صدا لگائی اے گلزار حقہ تازہ کیا؟

گلزار نے تنور کی آگ بھڑکاتے ہوئے جواب دیا آجاؤ منشی جی حقہ تازہ کر لیا اے۔ منشی رحمت علی نے حقے کی بد رنگ اودی نے مٹھی میں دبائی اور بڑے اطمینان اور فراغت کے ساتھ کش لگانے شروع کر دیئے۔ چھدا مات تو پہلے ہی کھا چکا تھا منشی جی کے اس اطمینان نے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ اطمینان اور بے نیازی کا مظاہرہ کرنے میں اگرچہ اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن اندر سے اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اور کوئی اکے والا آن ٹپکے اور اچھی خاصی سواری کو اچک لے لیکن وہ اتنی سستی آسامی بھی نہیں تھا کہ اس معمولی اعصابی جنگ میں منشی رحمت علی سے اتنی جلدی ہار مان لیتا۔ اس نے بدحواسی تو یقیناً نہیں دکھائی لیکن پھر بھی ذرا اک عجلت سے دانے کی بالٹی اکے کے خانے میں رکھی اور اکے کو جوتنا شروع کیا۔ گھوڑا جوتنے کے بعد وہ اکے پر بیٹھا اور اطمینان کے ساتھ آواز لگائی۔ روپ نگر کی سواری گلزار کی دکان پر حقہ کی گڑگڑ کی آواز بدستور ایک اطمینان اور بے نیازی کی کیفیت کا اظہار کئے جا رہی تھی چھدا نے ایک ڈیڑھ منٹ انتظار کیا اور جب حقے کی آواز میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تو اس نے طے کیا کہ تالاب کے گرد ایک چکر لگا لینا چاہئے اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور سواری سے مڈبھیڑ ہو جائے اس نے آہستہ سے لگام کھینچی اور گھوڑے نے خراماں خراماں چلنا شروع کر دیا۔ تالاب کے دوسری طرف پن چکی کے سامنے کلیا بھنگن کی بہو گھونگھٹ نکالے سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔ چھدا کئی مرتبہ مختلف طریقوں سے کھنکارا مگر کلیا کی بہو بھی ایسی نک چڑھی نکلی کہ اس نے چھدا کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ چھدا کو مجبوراً براہ راست خطاب کرنا پڑا۔

اری اس کلیا لنگڑی کو بہت روٹیاں لگ گئی ہیں۔ نہ جھاڑو دینے آوے ہے نہ ٹھکانوں پہ پہنچے ہے۔ تجھے تھکائے مارے ہے۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی ہمت افزا جواب موصول نہیں ہوا اور یوں بھی چھدا کو اس وقت اتنی فراغت کہاں میسر تھی جو وہ پہل کرتا۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور چند قدم آگے چل کر بڑی شان تغافل سے آواز لگائی روپ نگر کی سواریاں سامنے سیٹھ ہردیال مل کے مکان کے سب سے اونچے کنگرے پر ایک کالے سر والا سفید کبوتر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور چھدا کو یکا یک یاد آیا رات شمی کی کلسری گھر واپس

نہیں پہنچی تھی۔ ابھی وہ اس قدر سوچ پایا تھا کہ دور کی سڑک سے اکے کی گھڑ گھڑ کی آواز آئی اور اس کے ہڑ بڑا کر گھوڑے کے ایک چابک رسید کیا۔ چھدا کی قوت مدافعت نے بال آخر گھٹنے ٹیک دیئے ٹھیک گلزار کی دکان کے سامنے پہنچ کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور کسی قسم کا انتظار کئے بغیر سوال کیا۔ منشی جی آج تفصیل پہنچنے کے جی میں نئیں اے کیا۔

ہمیں تو تحصیل جانا ہی ہے تو نہ سہی تیرا بھائی اور سہی۔ مگر تو کہہ تیرے جی میں کیا ہے۔ اب اکہ چلاتا ہے کہ ٹھگی کرتا ہے۔

اجی منشی جی بگڑتے کیوں ہو۔ اکہ تو تمہارا ہی اے۔ بیٹھ جاؤ پیسے بھلے مت دیجو۔

منشی رحمت علی ٹھہرے وضعدار آدمی۔ اس بات پر بہت بگڑے۔ اب تو نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔ ہم چوٹے اچکے نہیں۔ لچے لفنگے نہیں۔ پہلے ناک پہ پیسہ مارتے ہیں پھر بیٹھتے ہیں کوئی اکے والا بتادے جو آج تک ہم کبھی مفت بیٹھے ہوں۔

تو میاں منشی جی غصے کیوں ہوتے ہو۔ پیسہ دھیلا کتی بڑتی دے دیجو۔ اچھا لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ چھ آنے دے دیجو۔

لیکن منشی رحمت علی ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے۔ انہوں نے کھرا جواب دیا چھ آنے تو تو مرتے مر جائے گا تب بھی نہیں دوں گا تو ہے کس ہوا میں۔

گلزار نے محسوس کیا کہ اب میرے بیچ میں پڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے چھدا کو ڈانٹ پلائی۔ ابے چھدا منشی جی کو کیوں تنگ کر ریا اے ٹھیک دام کیوں نئیں بتا دیتا۔

چھدا نے اپنی بے گناہی جتائی لو بھئی میں کیا تنگ کر رہا ہوں اتنا کرایہ کم کر دیا لیکن منشی جی ہیں کہ سامان میں نئیں آئے۔

گلزار بولا اچھا لے بھئی نہ تیری بات رئی نہ منشی جی کی۔ چونی ہو گئی۔

منشی رحمت علی نے ظاہری طور پر تھوڑی سی چپڑ چپڑ کی اور راضی ہو گئے۔ چھدا نے اپنی بات ایک دوسرے طریقہ سے بنا ہی۔

آج تو منشی جی سے ہی بونی کروں گا۔ بڑی بھاگوان سواری ہیں اور ٹاٹ کی پوشش درست کرتے ہوئے بولا اچھا تو بس بیٹھ جاؤ منشی کی اب دیر کا وقت نئیں اے۔

منشی رحمت علی دراصل ایک انفرادی سواری کی حیثیت سے چھدا کی نظر میں ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اہمیت اس لئے تھی کہ ان کی وجہ سے دوسری سواریوں کے لئے راستہ ہموار ہوتا تھا۔ چھدا اس نکتہ سے خوب آگاہ تھا کہ خالی چھتری پر کبوتر نہیں گرتا۔ پیسہ کو پیسہ اور سواری کو سواری کھینچتی ہے جس اکے میں پہلی سواری بیٹھ گئی سمجھ لو وہی اکہ سب سے پہلے بھرے گا۔ سواریاں ادبدا کر اسی کے پر ٹوٹتی ہیں جس میں کوئی سواری پہلے سے بیٹھی ہو۔ اس وقت اگرچہ اور اکے بھی اڈے پر آ گئے تھے اور ایک سے ایک

بڑھیا اکہ کھڑا تھا لیکن پھر بھی چھدا کا پلہ جھکا ہوا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ سارے اکے والوں سے اس کا مقابلہ نہیں تھا۔ روپ نگر کے سوا اور منزلیں بھی تھیں جہاں کی صدائیں لگ رہی تھیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت روپ نگر جانے والوں کا بازار سب سے گرم تھا۔ اللہ دیے کا اکہ سب سے زیادہ چمک رہا تھا۔ شاید اڈے پر سب سے اونچا اکہ اسی کا تھا۔ چھتری پر سفید لٹھے کا غلاف اس نے کل پرسوں ہی چڑھوایا تھا۔ پشت پر جو سفید پردہ لہرا رہا تھا۔ اس کے کناروں پر سرخ دھاگے سے بیل کڑھی ہوئی تھی۔ ڈنڈوں پر پیتل کی ایک ایک انچ چوڑی پتیاں چمک مار رہی تھیں۔ پھر گھوڑا خوب تیار تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پہیوں میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے تھے۔ نصر اللہ کا اکہ تھا تو چھوٹا سا لیکن سجا بنا وہ بھی خوب تھا۔ نصر اللہ نے اس مرتبہ اپنے اکے پر نیلا رنگ کرایا تھا پورا اکہ چمک رہا تھا اگر اس وقت اللہ دیے کا اکہ نہ ہوتا تو پھر نصر اللہ ہی نصر اللہ تھا۔ نصر اللہ بھی سواریوں کو گانٹھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کر رہا تھا لیکن چھدا ہر نئی سواری کی آمد پر کچھ اس انداز سے باگ اٹھا کر اپنے چلنے کے عزم کا اظہار کرتا تھا کہ سواری خواہ مخواہ اس کی طرف راغب ہو جاتی تھی۔ ایک سواری تو نصر اللہ کے اکے میں بیٹھی اور پھر اتر کر چھدا کے اکے میں جا بیٹھی۔ اس بات پر چھدا اور نصر اللہ میں خوب ٹھنی۔ نصر اللہ کو شکایت تھی کہ چھدا نے بے ایمانی سے سواری توڑی ہے۔ اور چھدا کہتا تھا کہ سالے تیرا اکہ نہ اکے کی دم سواری اتر کے میرے پاس چلی آئی۔ میں وسے منع کر دیتا۔ بڑی مشکل سے سارے اکے والوں نے مل کر بیچ بچاؤ کرای۔ البتہ اللہ دیا بہت مطمئن تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو وقار اس کے اکے اور گھوڑے سے ٹپک رہا تھا۔ وہی شان اس کی حرکات وسکنات سے عیاں تھی۔ اس وقت عام بھاؤ چونی سواری کا تھا۔ لیکن اللہ دیے کا تانگہ ربڑ ٹائر تھا وہ چھ آنے سے کوڑی کم لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے کسی سواری کو بڑھ کر اچکنے کی کوشش بھی نہیں کی وہ جانتا تھا کہ ایرا غیرا تو میرے اکے میں بیٹھے گا نہیں۔ رئیس سواریاں ہی بیٹھیں گی اور وہ میرے اکے کو دیکھ کر خود میری طرف آئیں گی پر میشری نے اللہ دیے کی طرف ہی رخ کیا تھا اور اللہ دیے نے بھی اس کا خیر مقدم کیا آجاؤ ٹھاکر صاحب لیکن چھ آنے کا نام سن کر پر میشری کا دم خشک ہو گیا اور وہ چپکے سے سٹک کر چھدا کے اکے میں جا بیٹھا۔ پر میشری کے آجانے سے اکے میں پانچ سواریاں ہو گئی تھیں۔ اکے میں نہ سہی لیکن چھدا کے دل میں اب بھی جگہ تھی لیکن سواریوں کا پیمانہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اب اگر اکہ نہیں چلا تو ہم سب اتر جائیں گے۔ چھدا نے ہنٹر اٹھا یار اکے والوں پر ایک فتح مندانہ نگاہ ڈالی۔ سب اکے والے اپنی اپنی جگہ زور مار رہے تھے کہ ہمارا اکہ اڈے سے پہلے چلے لیکن سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور چھدا نے بہت تمکنت سے اپنے گھوڑے کے چابک رسید کر کے اپنی روانگی کا اعلان کیا۔ چھدا نے اگرچہ اپنے اکے کی رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا لیکن جب دو قدم آگے بڑھنے کے بعد اس نے نتھوا چمار کی جورو کو بن ٹھن کر گلی سے

نکلتے دیکھا تو جلدی سے بڑھ کر پوچھا۔ اری روپ نگر چلے گی لیکن نتھوا کی جورو نے چھدا کی بات سننے سے صاف انکار کر دیا اور سونتی ہوئی اڈے کی طرف چلی گئی۔ آگے چل کر جب اس نے ایک گنواری کو سر پہ گٹھڑی رکھے ہوئے دیکھا تو اس کی نیت میں پھر فتور آ گیا اور سواریوں کے احتجاج کے باوجود اس نے اسے دعوت دے ہی ڈالی۔

اری ڈکریا روپ نگر چل رئی اے؟

گنواری نے چھدا کے سوال کا جواب سوال سے دیا۔ اچھا وری کا کہا لیوت ہے رے؟

''آ بیٹھا جا چونی دے دیجیو۔''

چونی کا نام سن کر گنواری بدک گئی اور سیدھی اپنے رستے پر ہو لی چھدا نے اسے پھر ٹوکا اری منہ سے تو پھوٹ تو کیاں دینے کیوے ہے۔

''موپہ تو اکنی اے۔''

لمبی بن مرنے چلی ہے کفن کا ٹوٹا اور تاؤ میں آ کر اس نے گھوڑے کو تڑاخ سے چابک رسید کیا۔

چھدا کا اکہ اب شفا خانے سے آگے نکل آیا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے ایک گرجدار آواز آتی ابے او چھدا اکہ روک۔ بے چھدا نے اکہ روک لیا۔ شیخ جی اپنی لاٹھی پٹخاتے مونچھوں کو تاؤ دیتے چلے آ رہے تھے۔ سواریوں کا اندر ہی اندر خون بہت کھولا اور چھدا بھی اس نئی سواری کے بارے میں کچھ زیادہ پر جوش نہیں تھا۔ لیکن دم مارنے کی مجاس کس کو تھی۔ شیخ جی آئے اور بغیر سواری چکائے اکے میں آن بیٹھے۔ منشی رحمت علی کو شیخ جی نے دیکھا تو بس کھل گئے۔

''اخاہ منشی جی ہیں۔ اماں کدھر کو۔''

''اماں کدھر کو کیا۔ وہی ملا کی ڈور مسجد تک۔ اس حرام زادی تحصیل کو جانا تو قبر میں جانے کے بعد ہی بند ہو گا۔''

بس اشارے کی دیر تھی سو وہ مل گیا تھا۔ شیخ جی جھٹ نمبردار کا ذکر نکال بیٹھے۔ منشی جی تم تحصیل سے اتنا کیوں بدکتے ہو۔ ایک اپنے نمبردار بھی تو ہیں روز کچہری میں کھڑے رہتے ہیں۔ ہر چھٹے مہینے ایک جعلی مقدمہ کھڑا کر دیتے ہیں جس روز عدالت کا منہ نہیں دیکھتے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

''اماں شیخ جی بات یہ ہے کہ منشی رحمت علی بھلا ایسے موقع پر کہاں چوکنے والے تھے اور نمبردار کا ذکر تو یوں بھی ان کے تخیل کے لئے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ میاں اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ پیٹ بری بلا ہے۔ یہ سب کچھ کراتا ہے ورنہ اشرافوں کا یہ طور تھوڑا ہی ہے کہ

روز تھانے تحصیل میں کھڑے رہو نمبردار صاحب سے پوچھو کہ بھلے آدمی تیرے الغاروں پیسہ بھرا پڑا ہے۔ تیری سات پشتیں بیٹھ کے کھائیں گی اور مزے کریں گی۔ تو نے اپنے پیچھے یہ کیا پخ لگائی ہے۔ آج اس پہ نالش ٹھونکی کال اس پہ مقدمہ چلایا پرسوں فلاں کی قرقی کرائی۔ بھلے مانس گھر میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر۔ غریب غرباؤں کو کچھ دے دلا کے جا۔ دنیا میں تو اتنا روسیاہ ہولیا۔ اب کچھ عاقبت کی فکر کر مگر۔۔۔۔

یہاں آ کر شیخ جی نے ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ شیخ جی یوں بھی زیادہ لمبی تقریر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور پھر عاقبت کے لفظ پر تو ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن بالکل ہی چھوٹ گیا۔ بات کاٹ کے بولے اجی عاقبت کی فکر تو کیجئے منشی جی ایسے لوگ اگر عاقبت کی فکر کرنے لگیں تو جہنم کے لئے ایندھن کہاں سے آئے گا۔ یہ شخص تو دوزخ کا کندا بنے گا کندا۔

منشی رحمت علی شیخ جی کی بات سے پورا پورا اتفاق تھا لمبا سانس لے کر بولے ہاں میاں یہ دولت ہے ہی بری چیز۔ آنکھوں پر چربی چھا جاتی ہے آدمی کو قارون کا خزانہ بھی مل جاوے تو بھی اس کی ہوس پوری نہیں ہوتی۔

چھدا اب تک تو گھوڑے پر چابک برسانے میں مصروف تھا۔ لیکن اب گھوڑا راہ پر آ گیا تھا چھدا کو جب اس طرف سے فراغت ہوئی تو اس کی طبع موزوں نے بھی زور مارا۔ میاں یہ نمبردار بڑا موذی ہے۔ سالے نے میرے پھوپھا کو اڑنگے میں لا کے وس کے سارے کھیت کوڑیوں میں خرید لئے۔ اور پھر ذرا آواز بلند کر کے بولا ''شیخ جی تمہیں یقین نئیں آئے گا یہ سالا چوروں سے ملا ہوا ہے۔''

شیخ جی کو بھلا کیوں یقین نہ آتا نمبردار صاحب کے متعلق وہ ہر بات یقین کرنے کو تیار تھے۔ چھدا کی بات پر انہیں اک ذرا تاؤ آیا بولے کہ ابے یقین نہ آنے کی کیا بات ہے۔ میں نمبردار کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اجی وہ سات تالوں میں بھی کوئی کام کرے گا تو مجھے پتہ چل جائے گا۔ اب تک تو خیر میں یہ بات منہ پر لایا نہیں تھا لیکن اب بات منہ پر آ ہی گئی ہے تو کہتا ہوں کہ مجھ اور یہاں آ کر شیخ جی کی آواز دھیمی پڑ گئی اور اس نے تقریباً سرگوشی کا انداز اختیار کر لیا۔ میاں محلّے میں جتنی چوریاں ہوتی ہیں ان سب میں نمبردار کا ہاتھ ہے۔

پرمیشری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ منشی رحمت علی کے منہ سے بے ساختہ اچھا نکل گیا لیکن چھدا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دعوے کی تائید بہت شاندار طریقے سے ہوئی تھی۔ اب اس نے اور ہاتھ پیر پھیلائے کہنے لگا اس نمبردار نے تو میرے باپ کا ٹیا کر دیا۔ وس نے اتنی محنت سے میری بہو کے لیے زیور اور کپڑا خریدا تھا۔ سالے نے کول لگوا دیا صبح جو اٹھیں ہیں تو کیا دیکھیں کہ گھر میں

ایک کی بجائے دو دروازے بنے ہوئے ہیں۔ جو اس دروازے سے لائے تھے وہ دس دروازے سے نکل گیا۔ اور یہ کہتے کہتے چھدا کو یکا یک احساس ہوا کہ گھوڑے کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ اس نے سانٹے سے ایک چابک رسید کیا لیکن گھوڑے کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ اس نے سانٹے سے ایک چابک رسید کیا لیکن گھوڑے نے آگے بڑھنے کی بجائے دولتیاں پھینکنی شروع کر دیں۔ چھدا نے تاؤ میں آ کر للکارا ہت تیری نانی کی بیٹی کی دم میں کھنکھنا اور سیر سیٹر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے مار کے آگے تو بھوت بھی جاگتا ہے چھدا کا گھوڑا تو پھر گھوڑا تھا۔ اڑ کے کھڑا ہو گیا۔ دولتیاں پھینکیں الف کھڑا ہو گیا ہنہنایا اور بال آخر پھر سیدھے سبھاؤ دوڑنے لگا اور جب اکہ اپنی پوری رفتار پر چلنے لگا تو چھدا کو ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چابک کا الٹا سرا خواہ مخواہ پہیئے کے ڈنڈوں پر لگا دیا۔ ڈنڈوں اور چابک کے تصادم سے پیدا ہونے والا کٹ کٹ کا ایک تیز شور پیدا ہوا۔ خام اور کھردری آوازوں کے اس ترنم میں چھدا نے اپنے آپ کو گم ہوتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے مزے میں آ کر تان لگائی۔

دیوارنہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

اب چھدا کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ شیخ جی اور منشی جی اب بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ نمبردار کے کردار پر تنقید کئے جا رہے تھے لیکن چھدا کو بس اب اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں دور سے دھند میں لپٹی ہوئی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی ہیں۔ اس غزل کا الٹا سیدھا ایک سالم شعر بھی یاد تھا۔ جب ایک مصرعہ پڑھتے پڑھتے اس کی طبیعت سیر ہو گئی تو اس نے ایک نئی ترنگ کے ساتھ اس شعر کو گانا شروع کیا۔

اسے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
دینا نہ تمہیں بھی کہیں دیوانہ بنا دے

لیکن سرور اور سرشاری کی یہ کیفیت دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ اچانک پیچھے سے ایک دوسرے اکے کی آہٹ ہوئی اور چشم زدن میں اللہ دیا اور اس کا تنومند گھوڑا برابر میں سیدھے ہاتھ پر نظر آیا اور اوجھل ہو گیا۔ البتہ اکے کی پشت پر لہراتا ہوا سفید پردہ کافی دیر تک نظر آتا رہا ممکن ہے چھدا اس واقعہ کو گول کر جاتا لیکن پرمیشری نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ منشی رحمت علی کو ٹھوک کر بولا منشی جی یو اللہ دیا چوکھا رہا۔ جبو ہمراہ کہ چلا تھا اوکے اکے میں کا ہو سیاری نائے تھی۔

چھدا بہت گھٹا کہنے لگا مہاراج اس کا اکہ ہے بھی تو ربتا ئیر

لیکن شیخ جی نے چھدا کی بات کاٹ دی ابے سالے اکے کی بات نہیں ہے اس کا گھوڑا بہت تیار ہے شارے پر چلتا ہے واہ کیا

گھوڑا ہے جسم شیشے کی طرح چمکتا ہے۔

''ہاں صاحب کھلائی کی بڑی بات ہے۔منشی رحمت علی نے لقمہ دیا۔''

شیخ جی کے لہجے میں اور گرمی پیدا ہوگئی۔منشی جی اس ٹکر کا گھوڑا اس وقت سارے قصبے میں کسی کے پاس نہیں ہے۔

اللہ دیئے کے گھوڑے کی تعریف پر چھدا کا تخیل بہک نکلا کہنے لگا میاں تم نے میری گھوڑی نئیں دیکھی۔واہ کیا فروٹ جاتی تھی۔ یہ سالا اللہ دیئے کا گھوڑا او سکے سامنے کیا ہے۔

''ابے تیرے پاس گھوڑی کس دن ہوئی تھی۔شیخ جی آج ہر طرح چھدا کی توہین کرنے پر تلے ہوئے تھے۔''

چھدا بھی گرم ہوگیا بولا'' شیخ جی تمہیں یہی تو پتہ نئیں اے۔میاں میں نے دلی میں گھوڑی خریدی تھی۔وہ گھوڑی تھی بس کیا پوچھو ہو۔او ہو ہو ہنٹر چھوایا اور ہوا ہوئی اور میاں جیسی گھوڑی تھی ویسا ہی تانگہ تھا منشی جی دلی میں اے نئیں چلتے۔

تو بگھیاں چلتی ہیں۔منشی رحمت علی نے بھن کر جواب دیا۔

لو میاں میں جھوٹ بول رہا ہوں چھدا کو بھی اپنے اوپر پورا اعتماد تھا۔سو سو روپے کی شرط رئی۔اگر کوئی دلی میں مجھے اک دکھا دے تو غلام بن جاؤں وا پہ تو تانگے چلتے ہیں۔میاں تانگہ بھی خوب ہووے ہے اور ٹپ پڑی ریوے ہے۔دھوپ ہو تو ڈال لو۔ہوا کھانے کو جی چاہے تو ٹپ گرادو۔

منشی رحمت علی اور جھلائے۔سالی سواری نہ ہوئی چھتری ہوگئی۔

چھدا نے بڑے فخر سے جواب دیا۔ہاں میاں یہی تو ٹھاٹ ہیں ایک ٹکٹ میں دو مزے۔دس تانگے سے میں نے بھی وہ کمایا کہ بس میرے پو بارے ہوگئے گھنٹہ گھر سے فوارہ فوارے سے جمعہ مجت یہ جمعہ مجت سے حوض قاضی۔حوض قاضی سے بارہ کھمبے اور جدھر نکل جاؤ سواریئں ہی سواریں لے لو۔یاں کی طربوں تھوڑائی کہ اڈے پہ بیٹھے اونگھ رئے ایں کہ اللہ بھیج مولا بھیج اور سواری آوے ہے ت وکی اٹی سے پیسہ نئیں نکلتا۔

شیخ جی بولے ابے وہ شہر ہے وہاں کا اور یہاں کا کیا مقابلہ۔

لیکن چھدا تو گرمی کھا گیا تھا۔اب وہ کہاں چپکا ہونے والا تھا بولا شیخ جی ایک دلی پہ ہی تھوڑائی ہے۔سال کے سال میرٹھ کی نوچندی پر جاوے تھا۔دلی سے نکل کے جو بھیا دوڑ لگے تھی تو بس پھر رکنے کا نام نئیں۔میرٹھ پہ ہی جا کے رکیں تھے۔میری گھوڑی بھی فر فر جاوے تھی بس ایک ہنٹر لگایا اور گھوڑی اڑن چھو ہوئی اور پھر میرٹھ میں دے پھیرے پہ پھیرا۔گھنٹہ گھر سے نوچندی نوچندی سے

گھنٹہ گھر سالے میرٹھ والے بھی میرے سامنے چوکڑی بھول گئے تھے اور بھیا شام کو نوچندی میں جا کے پشاوری سے آدھ سیر پروٹھے کباب تلوائے اور ڈیڑھ پا حلوہ لیا اور کھا پی موچھوں پہ تاؤ دیتے یار جی ٹھنڈ ٹھنڈ میں گھر کو آگئے۔

واہ بے مسخرے منشی رحمت علی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ ابے ساری شیخی تیرے ہی حصہ میں آئی ہے میں پوچھوں ہوں کہ تیرے جب یہ ٹھاٹ تھے تو تو یہاں کس لئے آمرا۔

منشی جی چھدا کی آواز گلوگیر ہو گئی یہ میرا باپ بڑا ستیاناسی ہے میں تو کبھی نہ آتا مگروس نے مجھے واں ٹکنے نئیں دیا یاں اب کرموں کی روؤں ہوں جو کما کے لایا تھا وہ سارا چوری میں نکل گیا۔

شیخ جی تو گویا ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ بس چوری کا لفظ پکڑ کے انہوں نے اپنی بات پھر شروع کر دی نمبردار پر جو گفتگو انہوں نے شروع کی تھی یا تو وہ خود تشنہ رہ گئی تھی یا پھر ان کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔ بہرحال چھدا نے بیچ میں جو موضوع چھیڑ دیا تھا۔ اس کے معاملہ میں وہ کچھ زیادہ پر جوش نہیں تھے اب جو چوری کی بات آئی تو شیخ جی کو ڈور کا ٹوٹا ہوا سرا مل گیا کہنے لگے میاں جب تک یہ نمبردار ہے اس وقت تک یاں کسی کا گھر بار محفوظ نہیں ہے۔

اماں لوٹ مار تو ان کا آبائی پیشہ ہے یہ دولت چھپڑ پھاڑ کے تو آئی نہیں ہے ایسے ہی جمع ہوئی ہے۔ اللہ بخشے ان کے باپ اشرف علی ان سے بھی چار جوتے بڑھے ہوئے تھے اور یہاں پہنچ کر منشی رحمت علی کی گفتگو نے ایک اور پلٹا کھایا اب گڑے مردے کیا اکھیڑنا میاں اشرف علی کی کیا حیثیت تھی۔ نال نکالا کرتے تھے۔ ہمارے والد مرحوم کو تو دنیا جانتی ہے کبھی پیسے کو پیسہ نہ سمجھا۔ جوئے کی لت پڑ گئی تھی۔ ساری دولت جوئے کی راہ اڑا دی۔ ایک روز جوا زوروں پر ہو رہا تھا۔ والد صاحب جب گرہ سے سب کچھ دے بیٹھے تو انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اشرف علی نے پچاس روپلی سرکا دیئے اور سید پور کا کاغذ لکھوالیا۔ مقدر کا کھوٹ وہ پچاس روپے بھی ہار گئے اور یوں میاں ہمارا پورا گاؤں ان حضرت اشرف علی کے ہتھے چڑھ گیا۔ شیخ جی نے اس بات کی بہت زور و شور سے تائید کی۔ جی یہ واقعہ کون نہیں جانتا آپ کے والد بھی بڑے جنتی تھے کوڑیوں کو مول ریاست بیچ ڈالی۔

منشی رحمت علی نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا میں ان پرانی باتوں کا کیا یاد کرنا۔ والد صاحب خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے بہت کمایا لیکن رکھنا نہ جانا اور کوئی ہوتا تو اس پیسے سے سونے کی دیواریں کھڑی کر جاتا مگر انہوں نے جتنا کمایا اس سے زیادہ کھایا اور جتنا کھایا اس سے زیادہ لٹایا۔ علی گڑھ کی مدار دروازے والیوں نے اسی پیسے سے محل کھڑے کرالئے اور زہرہ خان تو گھر ہی آ کر پڑ رہی تھیں۔

زہرہ جان کا نام سن کر چھدا تڑپ اٹھا واہ میاں زہرہ جان کی بھی کیا بات تھی۔ میرا باپ کہا کرے ہے کہ اس کی آواز کیا تھی بس پپیا تھی۔

منشی رحمت علی کی بات کو سہارا ملا تو وہ ذرا اور چہکے اماں یاں والوں نے اسے کہاں سنا ہے۔ جب یاں آئی تھی تو اس کا گلا خراب ہو چکا تھا۔ دشمنی میں آکر کسی نے اسے سندور کھلا دیا تھا مگر ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا۔ اس کے بعد بھی یہ حال تھا کہ محفل میں تہلکہ مچا دیتی تھی۔ بس والد صاحب اس کی آواز پہ لوٹ ہو گئے۔

شیخ جی نے لقمہ دیا اجی آپ کے والد کے بھی رئیسوں کے سے کاروبار تھے اور بھئی کیوں نہ ہوتے آخر کو بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے۔

منشی رحمت علی نے پھر لمبا سا ٹھنڈا سانس لیا۔ ہاں میاں خود چین کر گئے ان کی اولاد پاپڑ بیل رئی ہے جس کے گھر لکھ لٹتے تھے۔ اس کا بیٹا رحمت علی آج کا زندہ گیری کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے بچپن میں کبھی بگھی کے سوا دوسری سواری نہ دیکھی۔ آج کرائے کے اکوں میں بیٹھے پھرتے ہیں کوئی دھیلے کو نہیں پوچھتا۔

چھدا مرعوب ہو کر بولا ہاں جی آپ ٹھہرے پوتڑوں کے رئیس اور میاں پہ لمبردار صاحب اس مرتبہ شیخ جی کا فریضہ چھدا نے ادا کیا۔ لمبردار صاب تو مجھے یونہی لگیں ہیڈں میاں کچھ ای ہوون کی شہر میں عزت آبرو تو ہے۔ نئیں ہر شخص و نہیں گالتیں دیوے ہے۔

شیخ جی چمک کر بولے اماں عزت آبرو کہیں خالی پیسے سے ہوا کرتی ہے گھسیارا لاکھ راجہ بن جائے رہے گا گھسیارا ہی۔

چھدا کا گھوڑا اس وقت بقول چھدا فروٹ اڑا چلا جارہا تھا۔ گڈھوں والی سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔ سامنے سڑک دور تک ہموار نظر آرہی تھی اور خالی پڑی تھی۔ دائیں بائیں آم جامن اور شیشم کے ہرے بھرے درخت جھکے کھڑے تھے۔ اس وقت چھدا کی روح کا رواں رواں ناچ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا جب بھی بغیر ہنٹر کا انتظار کیے تیزی سے دوڑتا تھا۔ اس کی روح وجد کرنے لگتی تھی۔ اس نے مزے میں آکر ایک سوال کر ڈالا۔ میاں یہ نمبردار اپنے آپ کو سید کہویں ہیں۔

سید شیخ جی کے لہجہ میں طنز کے ساتھ ساتھ اہانت کا پہلو بھی پیدا ہو گیا تھا خدا کی قدرت دیکھو بہشتی بھی سید ہونے لگے۔ منشی جی سن رئے ہو۔

منشی جی بہت اطمینان سے کھنکارے اور پھر سر سے ململ کی گول ٹوپی اتارتے ہوئے بڑی متانت سے بولے میاں ہم اور کچھ تو جانتے نہیں لیکن ان کی دوباری میں مشک ٹنگی ہوئی تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔

منشی جی کا سہارا پا کر شیخ جی اور چمکے سقے کی اولاد پانی بھرتے بھرتے نمبر داری کرنے لگے۔

چھدا نے پھر ٹانگ اڑائی اجی دلی میں بشیر پنواڑی کی دکان پہ ایک خان صاب بیٹھا کریں تھے۔ونہوں نے لاکھ روپے کی بات کہی کہ میاں نہ کوئی سید ہے نہ پٹھان ہے نہ مغل نہ شیخ سب بھنگی چمار تھے۔اب مسلمان بن گئے۔منشی رحمت علی کو یہ بات مطلق پسند نہ آئی۔تھوڑی دیر تک تو چپکے رہے اور جب چھدا کی بات کا اثر زائل ہو چکا تو بولے کہ میاں شیخی کی بات نہیں ہے ہمارے خاندان کا تو شجرہ بھی تھا لیکن کیا کہیں اپنے والد صاحب کو بڑے بھولے تھے انہیں میاں نمبردار صاحب کے باپ ایک روز آئے گڑگڑا کے کہنے لگے کہ کلکٹر صاحب سے مجھے ملنا ہے ذرا اپنا شجرہ دو دن کے لئے دیدو۔والد صاحب جھانسے میں آگئے۔میاں وہ شجرہ ایسا گیا کہ پھر واپس نہیں آیا۔باپ چل بسے اب ان کا بیٹا اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔جہاں کوئی حاکم آیا اور شجرہ لے جا کے پیش کر دیا اب انہیں جا کے کون بتائے کہ کن کی باتوں میں آرہے ہو یہ تو سقے میں سقے۔

شیخ جی کچھ کہنے کے لئے پر تول ہی رہے تھے کہ یکایک اکے کا ایک پہیہ گڑھے میں گرا اور اکہ الٹتے الٹتے بچا گھوڑا پھر بگڑ گیا۔ چھدا نے چابک بھی برسائے اور چکارا بھی لیکن گھوڑے نے بھی اس مرتبہ آگے بڑھنے کی قسم کھالی تھی۔ چھدا جب تابڑ توڑ چابک رسید کرتا تھا تو اکے کو حرکت تو ضرور ہوتی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد دیکھتے تو اکہ آگے کے بجائے چند قدم پیچھے کھڑا نظر آتا تھا۔اسی اثناء میں پیچھے کھڑ کھڑ کی آواز آئی۔نصر اللہ کا اکہ برابر میں آن لگا تھا۔نصر اللہ نے برابر سے گزرتے ہوئے فقرہ کسا۔"ابے اس مریل ٹٹو کو بیچ میں لے کے کہاں کھڑا ہو گیا بھیا یہ سڑک پہ نئیں چلے گا وگڑے دگڑے چلا۔"

چھدا کا خون ایک تو ویسے ہی کھول رہا تھا۔نصر اللہ کا فقرہ سن کر اور بھن گیا تاؤ میں آکے جواب دیا۔ابے بجز پنجر پہ رنگ کرا کے اترا رہا ہے۔

نصر اللہ کہاں چوکنے والا تھا اس نے پلٹ کر آواز لگائی۔ پیارے اب کے پینٹھ میں اس شکرم کو للام کر دیجو کچھ پیسے اٹھ جاویں گے۔

چھدا بہت بھنایا لیکن کیا کرتا چپ ہوتے ہی بنی۔گھوڑا تھا کہ رسان میں ہی نہ آتا تھا۔اب منشی رحمت علی کو تحصیل کی فکر سوار ہوئی بولے کہ یار میرے آج تحصیل بھی پہنچائے گا یا نہیں۔

ہت تیری کی دم میں تہہ توڑ کنوئیں کے نل کا نمدا۔اور اس نے سڑ سڑ ہنٹر بجا ڈالے۔لیکن گھوڑے کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ نہ بلد نہ کھسکت نہ جنبد ز جا چھدا لاچار ہو کر اکے سے اتر آیا۔اس نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور آہستہ آہستہ چلانا شروع کیا۔بیس پچیس قدم

یوں چلنے کے بعد گھوڑا کچھ راہ راست پہ آیا چھدا اچک کر ڈنڈے پہ بیٹھ گیا اور کئی چابک جلدی جلدی رسید کر ڈالے گھوڑا پھر طرارے بھرنے لگا۔ چھدا نے اطمینان کا سانس لیا۔ مصیبت ٹل جانے کے بعد اس نے مصیبت کا جواز پیش کرنا شروع کیا۔ منشی جی گھوڑا بچارا کیا کرے۔ اس سڑک کو میں بس کیا کہوں وگڑاہی ہوئی ہے۔ میاں ولی کی سڑکیں تھیں ایسے ویسے آدمی کا تو وسپہ سے پیر رپٹ جاوے تھا اور تانگہ یوں جاوے تھا فٹا فٹ۔

پرمیشری کا چپکے بیٹھے بیٹھے منہ بندھ گیا تھا اس نے طویل سی جمائی لیتے ہوئے کہا شیخ جی اس سڑک کے بننے وننے کا بھی کچھ بونت بنت ہے۔

چین کی بنسری بجاؤ لالہ شیخ جی پھر اپنے پرانے موضوع پہ آ گئے جب تک نمبردار صاحب کا دم سلامت ہے س وقت تک تو اس سڑک کے دن پھرتے نہیں۔

پرمیشری بگڑ کر بولا۔ ''نمبردار صاحب اچھے چنگی کے ممبر بھئے سڑک ساری بھوس کا تھیلا بن گئی۔''

چھدا نے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ کیا یارو جب سے ہم نے ہوش سنبھالا یہ سارے کنکروں کے ڈھیر کنارے یونہی پڑے دیکھے سڑک تو بن چکی یہ تو بس غلیل کے غلوں کے ہی کام آئیں گے اور یہ کہتے کہتے اس کی توجہ کنکروں کی ڈھیریوں سے ہٹ کر درختوں پر مرکوز ہوگئی اکہ اس وقت آم کے گھنے درختوں کے نیچے سے گزر رہا تھا سیدھے ہاتھ پر مندر سے لگے ہوئے کنوئیں کی پکی منڈیر پر طوطوں کی کتری ہوئی ان گنت چھوٹی چھوٹی کچی امبیاں بکھری پڑی تھیں۔ مندر کی چھت پر اور کنوئیں کی منڈیر پر بہت سے چھوٹے بڑے بندر پر ہی طرح چیں کر رہے تھے۔ ایک بندر نے چھدا کی طرف رخ کر کے آہستہ آہستہ سے خو کیا اور پھر چپکا ہو گیا۔ چھدا کی طبیعت لہک اٹھی بولا یارو اب کے آم تو خوب ہوا ہے۔

پرمیشری نے گرہ لگائی۔ آموں کا بھاؤ اب کے مندہ رہے گا پر بابو فصل بھی وہ ہوئی ہے کہ جس نے باغ لے لیا وا کی چاندی ہی چاندی ہے۔ چھدا نے ایک اور اعتراض کیا مگر لالہ اب کے کویل نئیں بولی۔ پہاڑ سے آئی بھی ہے یا نہیں۔

شیخ جی کو اس کی اس بے خبری پہ بہت تاؤ آیا ابے سارے دن تیرا گھوڑا ہنہناتا ہے تو کوئل کی آواز کہاں سے سن لے گا۔

منشی رحمت علی بولے بھیا تجھے آم کھانے سے مطلب ہے نہ کہ پیڑ گننے سے تجھے کوئل سے کیا تجھے آم چاہئیں وہ تجھے مل جائیں گے سامنے ایک درخت کی جڑ سے ایک نیولا نکلا اور سٹاک سے سڑک عبور کر کے دوسری سمت میں کہیں جا کر غائب ہو گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی کھوسٹ بندریا سینے سے بچے کو لگائے خراماں خراماں سڑک کو عبور کر رہی تھی اور جب اکہ بالکل قریب آ گیا تو اس نے تیزی سے قدم

بڑھائے اور اچک کر ایک املی کے درخت پر چڑھ گئی۔

آبادی اب قریب آ گئی تھی دور کچی پکی عمارتوں کا ایک انبار نظر آ رہا تھا۔ اسب سے پہلے پر میشری کو بے کلی محسوس ہوئی۔ یوں بھی وہ سواریوں کے بیچ میں بڑا دبا ہوا بیٹھا تھا اس نے بمشکل تمام پہلو بدلا اور جماہی لیتے ہوئے بولا منشی جی تم تو تحصیل کے اڈے پہ اتر و گے؟

اور کیا تجھے کہاں جانا ہے راجہ۔

مورے کو تو پینٹھ جانا ہے۔

اچھا آج پینٹھ لگ رہی ہے۔ منشی رحمت علی بولے تو لالہ دو قدم پہ پینٹھ ہے اڈے سے اتر کے چلے جائیو۔

چھدا کا اکہ تحصیل کے سامنے اڈے پہ جا کے رکا جن اکوں کو وہ اڈے پہ چھوڑ کے روانہ ہوا تھا وہ یہاں سے اس سے پہلے آن موجود ہوئے تھے۔ نمبردار سڑک کے کنارے چھتری لگائے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے ان کا منشی بغل میں رجسٹروں کا بستہ دبائے کھڑا تھا منشی رحمت علی نے نمبردار کو دیکھا تو بچھ گئے۔ اماں نمبردار صاحب میں نے آپ کو اڈے پر بہت ٹٹولا آپ کہاں رہ گئے تھے۔

منشی جی کچھ گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی لیکن خیر اللہ دیئے نے بہت جلدی پہنچا دیا۔ نمبردار صاحب نے منشی جی کے جوش و خروش کا جواب اتنے ہی جوش و خروش سے دینا ضروری نہ سمجھا۔

شیخ جی ادھر سے بولے تو نمبردار صاحب واپسی طو ساتھ ہی ہو گی۔

نمبردار صاحب نے سوچتے ہوئے جواب دیا ہاں دیکھو آج یہ تحصیلدار نہ معلوم کس وقت تک رگڑے گا۔

پیچھے سے چھدا بولا نمبردار صاحب اکہ لئے کھڑا ہوں۔ بس آج تمہیں ہی لے کے چلوں گا۔

ابے گھوڑا اکہ ٹھیک ہے۔

اجی گھوڑا اکہ کیا کہہ رہے او نمبردار صاحب چھدا نے ساتھ میں چٹکی کا اشارہ کیا یوں پہنچاؤں گا۔ ادھر بیٹھے اور ادھر دن سے گھر پہ۔

◆◆◆

ایک بن لکھی رزمیہ

قادر پور میں بھی وہ رن پڑا کہ سننے والوں نے کانوں پہ ہاتھ رکھے۔ افراتفری تو خیر عام ہی تھی انسانی جانیں ہر جگہ ٹکے دھڑی بکیں۔ بس تولے ماشے کا فرق رہا۔ کوئی دو قدم پیچھے ہٹ کے مرا کسی نے چار قدم بڑھ کے جان دی کسی کی پیٹھ پہ گھاؤ آیا کسی نے سینے پہ وار روکے۔ قادر پور کی کیا ہستی تھی۔ اس ریلے نے تو پہاڑوں کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ لیکن پچھوا کے دم قدم کی خیر قادر پور میں تو نیزے پانی چڑھا۔ یاروں نے سروں پہ کفنیاں باندھیں اور ماؤں سے دودھ بخشوایا اور بیویوں کو خدا کے سپرد کیا اور اس آن بان سے رن کو چلے کہ پرانے زمانے کی لڑائیوں کی یاد تازہ ہوگئی پھر وہ ٹھنی وہ خون خچر ہوا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ جاٹ بھی وضعدار نکلے۔ ہاتھیوں پہ چڑھ کے آئے اور مشعلوں سے رات کے اندھیرے میں چراغ جلائے پچھوا کا نام بڑا تھا۔ اس کی وجہ سے قادر پور کے نام کا ڈنکا بجتا تھا قریب و دور سے جاٹ سورما آئے۔ ہاتھیوں کی قطار تھی۔ گولہ بارود اور تیر تلوار کے انتظامات کئے گئے اور یوں یہ ساز و سامان سے لدی پھندی فوج قادر پور فتح کرنے کے عزم سے روانہ ہوئی۔ عیدگاہ کے برابر والے بڑ کے درخت کی شاخوں میں مجید چھپا بیٹھا تھا۔ دور درختوں کے پیچھے روشنی دیکھ کر کچھ چوکنا ہوا اس نے بہت احتیاط سے فضا کو سونگھا۔ قریب و دور کی آہٹوں پہ کان لگائے اور آنکھیں مل کر اس روشنی کا تجزیہ کرنا چاہا اور بالآخر اسے یقین ہوگیا کہ جس گھڑی کا انتظار تھا وہ گھڑی آپہنچی ہے۔ اس نے دن سے نقارے پر چوٹ لگائی۔ ادھر نقارے پہ چوٹ پڑی ادھر قادر پور کے گھروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ نعیم میاں کے دونوں لڑکے اویس اور اظہر چھت پہ سو رہے تھے۔ نعروں اور نقارے کی آوازوں کا شور سن کر ان کے حواس باختہ ہوگئے۔ اویس کی تو گھگی بندھ گئی۔ اظہر سے اور کچھ بن نہیں پڑی تو وہ اٹھا اور بے تحاشا چھتوں کو پھلانگتا ہوا جولاہوں والی مسجد کی چھت پہ جا پہنچا۔ یہاں آ کر چھتوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا اور اب اظہر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مزید کیا اقدام کرے۔ نیچے رحمت کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے لاٹھی پٹختے ہوئے للکارا کون ہے۔ اظہر نے بڑی مشکل سے اپنے اوسان سنبھالے اور جیسے تیسے کر کے اپنا تعارف کرایا۔ رحمت کے ہونٹوں پہ ایک حقارت آمیز ہنسی کی لہر دوڑ گئی میاں تم نے تو علی گڑھ کالج کا نام ڈبو دیا۔ رحمت کے نقطہ نظر سے قطع نظر اظہر اور اویس دونوں علی گڑھ کے نکلے ہوئے تھے اور جب وہ جلوس میں تن تن کر نعرے لگائے تھے کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان تو ان کی آواز میں عزم کی ایک عجب شان پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن ہندوستان کے بٹوارے کے بعد وہ ڈرے ڈرے رہنے

لگے تھے۔نعیم میاں کی جب آنکھ کھلی تو اظہر کی چار پائی خالی پڑی تھی اور اویس کی آنکھ بندھی ہوئی تھی۔انہوں نے ہڑ بڑا کر بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی اٹھائی لیکن چوپال میں یارلوگوں نے اس دھوم سے نعرہ تکبیر بلند کیا کہ ان کے ہاتھ سے کارتوسوں کی پیٹی گر پڑی۔ چوپال میں جاگ باگ ہوگئی تھی لوگ اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر باہر نکل رہے تھے۔جعفر نے اپنا صافہ درست کرتے ہوئے بلم سنبھالا اور چلتے چلتے حقے کے کش لگانے لگا۔ پیچھے پچھوا اپنا تہمد درست کر رہا تھا۔اس نے آواز لگائی پہلوان یہ حقے کا وقت نئیں اے۔ اور جعفر حقہ چھوڑ چھاڑ بلم پٹختا ہوا چوپال سے باہر نکل گیا۔پچھوا نے بہت اطمینان سے تہمد میں کس کے گرہ لگائی۔اپنے گلے کا چاندی میں منڈھا ہوا تعویذ درست کیا۔کرتے کی آستینوں کو اکسا کر ان میں الیٹ دی اور پھر اپنی ہتھیلیوں کو تھوک سے ذرا نم کیا اور اپنی لاٹھی کو ہاتھ میں لے کر بولا۔چلتے چلتے اس نے آواز لگائی۔

''اے ممدا اور جب جواب میں کوئی نہیں بولا تو اس نے ایک ذرا جھنجلا کر آواز لگائی۔اے اوسور کے بچے ممد سالے کدھر مر گیا۔

ممد گلے میں واسکٹ ڈالتا ہوا ایک کونے سے لپکا۔استاد یہ ریا۔

اے استاد کے بچے باہر نکلے گا یا نئیں اور دیکھ لے یہاں آ کر پچھوا کا لہجہ دھیما پڑ گیا دیکھ لے تو جولاہوں والی مسجد کے مورچے پہ ڈٹا رئیو ادھر میں سب سلٹ لوں گا۔

ممد کو ہدایت دے کہ پچھوا اپنے چند پٹھوں کے جلو میں چوپال سے باہر نکلا چوپال سے باہر نکل کر اس نے ایک نگاہ حویلی پہ ڈالی۔ حویلی پہ جو دستہ متعین تھا اس کی قیادت کلوا کر رہا تھا۔پچھوا کو دیکھتے ہی وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور نعرہ لگایا۔استاد پھکر مت کرو۔ ادھر جو آئے گا سالے کو بکل اڑا دوں گا۔

پچھوا کو سب سے زیادہ فکر حویلی کے مورچے کی تھی۔حویلی کا معاملہ تھا بھی نازک ساری بستی کی عورتیں اس کے اندر جمع تھیں اگر چہ حویلی کے اندر ایک اندھیرا کنواں موجود تھا اور ہر عورت کو اس کا فرض اچھی طرح سمجھا بھی دیا گیا تھا پھر بھی وضعداری کے طور پر چند ایک پھانسی کے پھندوں کا اہتمام کیا گیا تھا پچھوا نے اپنے کئی جی دار پٹھوں کو حویلی پہ تعینات کیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ سالوں اگر کسی نے بوداپن دکھایا تو بھون کے کھا جاؤں گا اور کلوا کی جیداری پہ اسے یوں بھی بہت تکیہ تھا اس کی آواز پہ وہ مطمئن ہو گیا اور اپنی لٹھیا کو تولتا ہوا آگے بڑھا۔نقارے کی آوازوں میں اب اک ذرا گھبراہٹ کا احساس نمایاں ہو چلا تھا ادھر دور سے سنکھ کی آوازیں بھی اب آنے لگی تھیں پچھوا نے قدم تیز کئے۔دوسرے گھروں سے بھی لوگ نکل نکل کر چلے آ رہے تھے۔قربان علی چار پائی کی پٹی لئے گھر سے نکل آئے تھے۔شور مچنے پر انہوں نے جب اپنے گھر کے کونے بچالے ٹٹولے تو یہ انکشاف ہوا کہ ان کے یہاں کوئی بڑا ہتھیار کیا

معمولی لکڑی بھی نہیں ہے۔ ایک تو غصہ پھر ایجاد کی ماں کا دباؤ انہوں نے جھٹ پٹ چارپائی کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ سید حامد حسن کے یہاں نینی تال اور دہرہ دون سے تحفہ میں آئی ہوئی کئی خوبصورت چھڑیاں تو موجود تھیں لیکن لاٹھی کی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی تاہم اپنی اور اپنی بیوی کی عرق ریز کوششوں کے بعد وہ ایک سوکھی سڑی گپتی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے البتہ منشی ثناء اللہ کو اس قسم کی کسی پریشانی سے سابقہ نہیں پڑا سامنے صحن میں کمروں کے جالے صاف کرنے کا بانس رکھا تھا۔ انہوں نے لپک کر اسے اٹھایا اور چھپاک سے باہر نکل آئے صوبیدار صاحب کے سامنے لاٹھی کا سوال تھا ہی نہیں۔ ان کے پاس ایک توڑے والی بندوق موجود تھی۔ جسے وہ وقتاً فوقتاً صاف کرتے رہتے تھے۔ لاٹھیوں کے ہجوم میں کئی ایک اور بندوقوں کی نالیں بھی بلند نظر آرہی تھیں۔ حمیدا کی واسکٹ کی جیبوں میں غلے بھرے ہوئے تھے۔ اور ہاتھ میں شیشم کی سیاہ چمکتی ہوئی غلیل تھی پچھوا سے چند قدم پیچھے رسولا اور بھلن تھے جن کے کاندھوں پہ اناروں سینگوں اور ختنکوں پر مشتمل ایک پورا بارود خانہ لدا ہوا تھا۔ پیچھے اللہ راضی کی ٹولی ایک بھنگم قسم کی توپ لئے چلے آرہی تھی۔ یہ توپ آج سے پہلے چل بھی چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت اس کا رخ خود اللہ راضی کے ساتھیوں کی طرف تھا اور اللہ راضی کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ اسے بند کیسے کیا جائے۔ کئی آدمی بری طرح زخمی ہوئے اور اس چکر میں کئی آدمیوں کو پولیس نے دھر لیا۔ لیکن اس مرتبہ اللہ راضی کو یقین تھا کہ وہ اس کے ساتھیوں کا نہیں بلکہ اس کے دشمنوں کا بھرتا کرے گی۔ پچھوا کے ساتھی اگرچہ بالعموم لاٹھیوں سے مسلح تھے لیکن وقت کے نئے تقاضوں کے ماتحت ان لاٹھیوں کی شکل میں تھوڑی سی ترمیم کر لی گئی تھی۔ وہ اب سیدھی سادی لاٹھیاں نہیں رہی تھیں۔ ان میں بلم لگائے گئے تھے۔ لیکن پچھوا کی لاٹھی اپنی اسی سابقہ حالت میں تھی۔ تین دن تک تیل میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے وہ ذرا زیادہ چکنی ضرور نظر آرہی تھی۔ لیکن تیل کی چکناہٹ لاٹھی کی انفرادیت کو مجروح تو نہیں کرتی اسے اور چمکاتی ہے۔ یہ تو بلم ہے جس سے لاٹھی کی انفرادیت زائل ہو جاتی ہے بلم لگنے کے بعد لاٹھی لاٹھی نہیں رہتی بلم بن جاتی ہے۔ ممد کلوا رحمت اور جعفر کی لاٹھیاں چولا بدل کر بلم بن گئی تھیں۔ لیکن پچھوا کی لاٹھی حسب سابق اب بھی لاٹھی ہی تھی پچھوا کی لاٹھی میں ترمیم کے معنی یہ ہوتے کہ اسے اپنی ذہنیت میں بھی ترمیم کرنی پڑتی۔ یہ لاٹھی تو اس کی انفرادیت کا ایک جز بن گئی تھی۔ ایک لحاظ سے وہ اپنی انفرادیت کھو کر اس کی شخصیت میں گم ہو گئی تھی چنانچہ پچھوا کی لاٹھی اب خالص و محض لاٹھی نہیں تھی بلکہ پچھوا کی لاٹھی تھی۔ اسے عصائے موسیٰ سے تشبیہ دینا تو غلط ہو گا عصائے موسیٰ کی تو حضرت موسیٰ سے الگ اپنی حیثیت تھی۔ حضرت موسیٰ ایک معنوں میں عصائے موسیٰ کے دست نگر تھے۔ عصائے موسیٰ حضرت موسیٰ کا دست نگر نہیں تھا لیکن پچھوا کی لاٹھی پچھوا کی لاٹھی تھی۔ معجزے اس نے بھی بہت دکھائے تھے لیکن اعجاز لاٹھی کے بغیر لڑنا۔ ٹنڈا پہلوان کی پارٹی نے تو یہ سمجھا تھا کہ اس وقت پچھوا نہتا ہے کیا کر سکتا ہے۔ چلو آج اس کا ٹنٹا ہی ختم

کردیں پچھوا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پٹ اپنے سرکار رومال کھلوایا اور انٹی سے ایلگو الیاری پیسہ کھول اس میں باندھ لیا اور ہاتھ دکھانے شروع کر دیے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر اس نے تین لاٹھیاں رکھوا لیں جو کلائیاں ٹوٹیں وہ لبھاؤ میں رہیں اور پھر اس نے ان کی جوتی ان کی ہی چاندی ٹنڈا پہلوان کے ساتھی اتنے جیدار کہاں تھے کہ ٹک کر مقابلہ کرتے دو چار سر پھٹے تو بس بھاگ نکلے۔

ٹنڈا کے پٹھے بیچارے تو خیر کس کھیت کی مولی تھے پچھوا تو پورے پورے گاؤں سے نبٹنے کو تیار رہتا تھا۔ صوبیدار صاحب کو جب پچھن پورے والوں نے گھیرا تھا تو وہاں پچھوا بھی موجود تھا۔ صوبیدار صاحب نے بھی ستم کیا قازیں نہیں ملیں تو انہوں نے مور پہ ہی گولی چلا دی بس پھر کیا تھا چاروں طرف ہلچل مچ گئی۔ پچھن پورہ برابر میں لگا ہوا تھا۔ گنوار اپنے موٹے موٹے لٹھ سنبھالے چڑھ آئے نعیم میاں ایسے موقعے پر کب ٹھہرنے والے تھے چاروں طرف شور ہوتا جو دیکھا تو بس تیر ہو گئے حمیدا سے اور کچھ بن نہ پڑا۔ پاس ہی بھٹوں کا کھیت تھا اس میں جا چھپا اللہ راضی صحیح سلامت نکل گیا تھا لیکن اس اتفاق کو کیا کہیے کہ ایک کھیت میں کوئی کسان ہل جوت رہا تھا اس نے بڑھ کے دو چار جھانپڑ اڑا دیے سید حامد حسن کو ان کی سست روی لے ڈوبی۔ لاچار انہوں نے چکنی چپڑی باتوں سے انہیں شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن گاؤں والے ایسی پٹی کب پڑھے تھے صوبیدار صاحب حیران و پریشان تھے کیا کریں کیا نہ کریں' پچھوا بھن گیا۔ اس نے یا علی کہا اور لاٹھی لے کے پل پڑا۔ کئی گاؤں والوں کو اس نے سنگھوا لیا۔ نہ معلوم کتنوں کی کلائیاں توڑیں کتنوں کے گٹے اتارے اور جب صوبیدار صاحب اور پچھوا قادر پور واپس پہنچے تو ان کے ساتھ مور کے شکار کے ساتھ ساتھ موٹی موٹی لاٹھیوں کا ایک ڈھیر بھی تھا۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس مرتبہ پچھوا اور ٹنڈا پہلوان میں بلو پہاڑن کے سوال پر چلی تھی ورنہ اصل بات یہ ہے کہ پچھوا کا مخصوص مشغلہ عورت بازی نہیں تھا۔ یوں بند تو وہ اس میدان میں بھی نہ تھا لیکن اس کا اصل شوق تو دوسرا ہی تھا چنانچہ اس سے پہلے نصیرا کے معاملہ پر پچھوا اور ٹنڈا میں چل چکی تھی ٹنڈا پہلوان کے اکھاڑے میں نصیرا کو قانونی طور پر تو ایک پٹھے ہی کی حیثیت حاصل تھی یہ الگ بات ہے کہ لوگ اس کی اس قانونی حیثیت پر ایمان لانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے پچھوا کی زبان کو یوں بھی لگام نہیں تھی اور اللہ راضی بنواڑی کی دکان پر بیٹھ کر جب وہ کلے میں پان کی گلوری دبا کر بیڑی کے کشش لگاتا تھا تو پھر اور ترنگ میں آجاتا تھا۔ ایک روز کہ وہیں بیٹھے بیٹھے نصیرا کو دیکھ کر وہ اتنا بے قابو ہوا تھا کہ اس نے بے ساختہ آواز لگائی پلٹ تیرا دھیان کدھر۔ نصیرا بہت کھسیانا ہوا۔ ٹنڈا پہلوان ان کو جب یہ اطلاع پہنچی تو اس کا تو خون کھولنے لگا اگر اور کوئی ہوتا تو اسے تو وہ چومیخہ کر کے چھوڑ دیتا لیکن مقابلہ پہاڑ اور اونٹ کا تھا پھر بھی ٹنڈا اپنی نژ میں تھا۔ اس نے پچھوا کے اس اقدام کو جارحانہ اقدام قرار دے دیا کئی مہینے تک جھگڑا چلا خوب خوب

معرکے ہوئے لیکن ہر مرتبہ ٹنڈا پہلوان کی کرکری ہوئی کچھ اس جھگڑے پر موقوف نہیں تھا پچھوا اور ٹنڈا پہلوان کی یوں بھی نہیں پٹتی تھی۔
ٹنڈا پہلوان کو اپنی استادی کا زعم تھا لیکن پچھوا سرے سے اس کی استادی ہی سے منکر تھا۔ جہاں کسی نے ٹنڈے کا ذکر کیا اور پچھوا بگڑا اماں وہ نائی کی اولاد وہ سالا کیا کھاکے استادی کرے گا میاں ہر مرتبے تعزیوں پر وسکا اکھاڑہ پھسڈی رہ جاوے ہے۔
مگر خلیفہ اللہ راضی محض بات کو آگے بڑھانے کی غرض سے شوشہ چھوڑتا اب کے وہ بڑے زوروں سے تیاری کر ریا اے۔
پچھوا کو اور تاؤ آتا۔ اماں تیاری سالی کیا چینگ لگادے گی۔ وس نے چلایا ہے استرا لکڑی کے ہاتھ وہ کیا جانے۔
اب ممد گرمی کھا جاتا۔ استاد اس سالے نائی والے کی چاند پھر کھجلا رئی اسے وے چپتا دیا جائے۔ سارا گاماں پن نکل جاوے گا؟
میاں میں نے تو وسپہ وہ مار بجائی تھی کہ بیٹا کی کھوپڑی پلپلی کردی تھی مگر واہ بے بے حیا سالا پھر منہ آنے لگا۔
ممد پچھلے کارناموں پہ قناعت کرنے کا عادی نہیں تھا فوراً کہتا استاد بہت دن ہوگئے اب تو ہوجاوے ایک ایک پانی قسم استادی اب کے وہ مار ماروں کو سالوں کے ٹخنے ڈھیلے ہوجاویں گے
اے میں تو خود اس چکر میں ہوں کہ ہوجائے رنا کا سالے ٹنڈے کو پر قینچ کرکے چھوڑ دوں گا۔ پر وہ تو سالا کنی کاٹ کاٹ جاوے ہے۔
پچھوا کا عذر ایک حد تک صحیح تھا۔ ٹنڈا پہلوان کی پارٹی ویسے بودی نہیں تھی اور جہاں تک زبانی جمع خرچ کا تعلق تھا وہ ڈینگیں مارنے میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ لیکن پچھوا سے جب مقابلے کی نوبت آئی تھی تو وہ کسی نہ کسی قیامت کو ٹلا جانے کی کوشش کرتا تھا۔
قادر پور کے عقل پرست طبقہ کا تو یہی حال تھا کہ پچھوا بنوٹ کا ماہر ہے لیکن اوہام پرست لوگوں نے طرح طرح کے قصے مشہور کر رکھے تھے کہنے والے کہتے تھے کہ پچھوا جادو جانتا ہے اس قسم کا سب سے زیادہ شبہ بھلن کو تھا اس نے کئی مرتبہ برملا اپنے شبہ کا اظہار کیا میاں ہو ہو پچھوا کے قبہ میں کچھ ہے۔
رسولا نے اس کی تائید بہت زور و شور سے کی اور ساتھ میں ایک دلیل بھی دے ڈالی۔ اماں حریانی کی بات تو یہ ہے کہ پچھوا نے ایک مرتبہ جن کو پٹخنی دے دی۔ بنو میئے ہم نے بھی بہت سے دیکھے ہیں اور میاں لکڑی چلانا کوئی کیسی ہی جانے مگر جن کا مقابلہ تھوڑا ہی کرسکے ہے یہ تو تم مجھ سے لکھوالو کہ وسے کوئی عمل یاد ہے۔
اللہ راضی کو پچھوا کے گلے میں پڑے ہوئے تعویذ پہ شبہ تھا لیکن حمید اقسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ عیدگاہ کے پیچھے ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں ایک ٹانگ پہ کھڑے ہوئے پچھوا کچھ پڑھ رہا تھا نہ ہو کسی فقیر نے وسے کوئی وظیفہ بتایا ہے۔

وسکا وہ وظیفہ پورا ہو گیا۔

لیکن جعفر کی روایت مختلف تھی وہ کہتا تھا میاں بات یہ ہے کہ ان سالے ہندوؤں نے جب جولاہوں والی مسجد کو ڈھینا چاہا تھا تو پچھوا نے بڑی جی داری دکھائی۔ میاں وہ لکڑی چلائی کہ سالوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ بس جی رات کو وہ خواب میں کیا دیکھے ہے کہ مولا علی آئے ہیں اور دس کی پیٹھ ٹھونک رے ایں تو بس جی یہ سب مولا علی کا طفیل ہے۔ ورنہ کیا بیچارے پچھوا اور کیا وتکی بنوٹ۔

لیکن یہ سارے اختلافات سبب اور علت کے بارے میں تھے پچھوا کی سورمائی بنفسہ مسلم الثبوت تھی پچھوا لوگوں کو اتنی مہلت ہی نہ دیتا تھا کہ وہ اس کی سورمائی کے بارے میں شک کریں۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کسی نہ کسی بہانے وہ کسی گروہ سے لڑائی مول لے لیتا تھا اور یوں اپنی قوت آزماتا رہتا تھا پچھوا نے لڑتے وقت یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ تو اندیشہ سود و زیاں سے بلند ہو کر لڑتا تھا۔ اپنے فن کو اس نے مقصدیت کی گندگی سے کبھی آلودہ نہیں کیا۔ لڑنا خود اس کے لئے ایک مقصد تھا۔ اس کی بنوٹ بازی 'لاگ' سے ہمیشہ پاک رہی۔ فرقہ وارانہ فسادات کا طوفان جب شروع ہوا تو پچھوا نے تمام دوسرے سوالوں اور پہلوؤں کو بالائے طاق رکھ کر اس پہلو پہ غور کیا کہ اب اسے ذرا کھل کر اپنی لکڑی کا فن دکھانے کا موقعہ ملے گا اس نے بہت تمکنت اور جوش میں آ کر اپنی ٹولی کو حکم سنایا کہ بے جوانو کمر کس لو۔ سالو بہت دنوں میں مولا پیارے نے سنی ہے وہ بہار آئے گی کہ رہے نام سائیں کا۔

پارٹی والوں نے جب یہ خبر سنی تو خوشی سے پھول کے کپا ہو گئے۔ ممد بے ساختہ کہہ اٹھا قسم استاد کی اگر قادر پورے کے نام کے جھنڈے نئیں گاڑ دیئے تو ممد اپنے باپ سے نئیں اے۔

کلوا تن کر بولا پنچ میری لٹھیا کو تو رکھے رکھے دیمک لگی جا رئی تھی۔ اب ذرا اس پہ لال مالش ہو گی تو رنگ آوے گا۔

پچھوا کے ساتھیوں نے آنے والے جشن خونریزی کے لئے اس ٹھاٹ سے تیاریاں کیں جس ٹھاٹ سے لوگ عید کی تیاریاں کرتے ہیں لیکن یہ سب ٹھاٹ پڑا رہ گیا۔ دیکھتے دیکھتے فساد کا رنگ بدل گیا قادر پور کے نام کے جھنڈے گاڑنے کا سوال تو ختم ہوا۔ اب تو بس اس کا جھنڈا بلند رکھنے کا سوال تھا۔ پچھوا کو ہوا کا رخ پہچاننے میں بہت دیر لگی جارحانہ اقدامات تو اس کے لئے اوڑھنا بچھونا تھے لیکن مدافعتی کارروائی کی اصطلاح زمانے نے اس کی گوشمالی کر کر کے اسے ذہن نشین کرائی۔ پاکستان بننے کی اطلاع جب اسے ملی تو وہ بہت سرد ہوا۔ بڑی حسرت سے ہاتھ مل کر کہنے لگا۔ میاں ہم بیٹھے ہی رہ گئے واں قلعہ فتح ہو گیا۔ اور غصہ میں آ کر اس نے اپنے آپ کو اور سارے قادر پور والوں کو ان کی بے خبری کے جرم میں بے نقط گالیاں دیں پچھوا کو قلعہ فتح ہونے کی تو خوشی تھی لیکن اس بات کا ملال تھا کہ اس بادشاہی کے سودے میں اس کا خون صرف نہیں ہوا۔ جب خوب اظہار تاسف کر چکا تو اس نے کہا کہ میاں جو ہونا تھا وہ

ہو چکا۔ چلو اب چل کے عید گاہ والے پیپل پہ پاکستانی جھنڈا تو لگا دیں قادر پور کے دوسرے لوگوں کو جب پچھوا کی نیت کا علم ہوا تو ان کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے پچھوا کو بہت سمجھایا بجھایا اور پاکستان کا پورا نقشہ سمجھایا پچھوا بہت سٹپٹایا اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ قادر پور جس میں پچھوا رہتا ہے۔ پاکستان سے باہر کیسے ہو سکتا ہے لوگوں کے کہنے سننے سے اس نے پاکستانی جھنڈا لہرانے کا ارادہ تو ترک کر دیا لیکن پھر ممدا اور کلو کے مشورے سے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان نے اپنی ذات برادر سے ہمیں خارج کر دیا تو اپنی بلا سے ہم اپنا پاکستان الگ بنا لیں گے چنانچہ طے ہوا کہ عید گاہ والے پیپل پہ پاکستان کا نہیں بلکہ پچھوا کی پارٹی کا اسلامی جھنڈا لہرایا جائے۔ لوگوں نے جب یہ سنا تو اور گھبرائے بیچارے نعیم میاں کا حال ویسے ہی پتلا تھا۔ جب انہیں یہ اطلاع ملی تو ان کے حواس باختہ ہو گئے انہوں نے پچھوا کو اونچ نیچ سمجھائی اور ہر طرح سے اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن پچھوا نے کورا جواب دیا۔ میاں اس کان سنو یا وس کان سنو۔ قادر پور میں کانگرس کا جھنڈا نئیں لہرائے گا۔ پچھوا کے اکھاڑے کا جھنڈا لگے گا۔ نعیم میاں بہت تلملائے۔ بہت گھبرائے لیکن کیا کرتے۔ پچھوا اب ان کے قابو میں نہیں تھا۔ پہلے تو وہ ان کا بڑا مطیع و فرمانبردار تھا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے پچھوا کو ان سے شکایت پیدا ہو چلی تھیں اور اس نے کھلے الفاظ میں اپنی بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ اب نعیم میاں بھی تو پہلے سے نہیں رہے تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈر وہ اب بھی کہلاتے تھے لیکن ان کا وہ وظیفہ اب باقی نہیں رہا تھا۔ پہلے تو وہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار رہتے تھے۔ کوئی کانگرس کا نام لے دیتا تو بس آپے سے باہر ہو جاتے تھے ہندو سے تو وہ بات کرنے کے ہی روادار نہیں تھے لیکن تقسیم کا اعلان ہوتے ہی ان کا طور کچھ بگڑ گیا۔ پاکستان کیا بنا بیچارے نعیم میاں بیٹھے بٹھائے ننانوے کے پھیر میں پڑ گئے۔ اب تو وہ مسلم لیگ اور پاکستان کے ناموں سے بھی کچھ بدکنے لگے تھے۔ لیکن خیر ان کی عاقبت سدھر گئی۔ اگست کے اندر اندر وہ پاکستان اڑ لئے۔ قادر پور میں تو وہ یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم لوگ ذرا دلی جا رہے ہیں لیکن پندرہ بیس دن بعد ان کا لاہور سے صوبیدار صاحب کے نام خط آیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ بھئی دلی میں جتنے بڑے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ سب نے یہی کہا کہ بھائی اب ہندوستان میں مسلمان کا جان و مال محفوظ نہیں ہے بس اب تو پاکستان میں ہی ٹھکانہ ہے۔ راستہ بڑی پریشانی میں کٹا۔ لیکن خدا کا شکر ہے ہم اپنی مملکت میں بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ اطہر میاں محکمہ بحالیات میں ملازم ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں اویس میاں کو بھی کوئی روزگار مل جائے گا۔ قادر پور میں اب کیا رکھا ہے۔ آپ بھی آنے کی کوشش کریں۔ خدا کے فضل سے میرا یہاں رسوخ کافی ہے کچھ نہ کچھ سلسلہ ہو ہی جائے گا۔

پچھوا نے جب خط کا مضمون سنا تو اس نے اللہ راضی کی دکان پر کھڑے ہو کر نعیم میاں کو بے نقط گالیاں دیں لیکن سانپ تو پہلے ہی

سٹک گیا تھا اب لکیر پیٹنے سے کیا بنتا تھا ممکن ہے نعیم میاں ابھی تھوڑے دن اور نہ جاتے لیکن ان کے پتر پچھوا نے ہی اکھاڑے۔ انہوں نے اسے لاکھ سمجھایا بجھایا لیکن اس نے ترنگ میں آ کر پیپل پہ اپنا جھنڈا نصب کر ہی دیا یورش تو ہوتی ہی لیکن ابھی پچھوا کے نام کی وجہ سے جاٹ ذرا ہچکچا رہے تھے لیکن اس کا یہ اقدام خاصا اشتعال انگیز تھا اور جاٹوں نے آج کا کام کل پر نہ چھوڑو کی حکمت پر عمل کر کے قادر پور پہ ہل بول ہی دیا۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس لڑائی میں پچھوا کے ساتھیوں نے جاٹوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ لیکن نعیم میاں ایسے بے وقوف نہیں تھے جو زمانے کے رنگ کو نہ پہچانتے وہ جانتے تھے کہ قیامت ٹل گئی ہے لیکن عارضی طور پر۔

نعیم میاں کے خط سے قادر پور میں ہلچل مچ گئی۔ تیسرے دن منشی ثناء اللہ کا بستر بوریا بندھ گیا۔ اس ہفتے جب پینٹھ لگی تو کباڑیوں کی دکان پر لوگوں نے گھریلو سامان کے اڑنگ لگے ہوئے دیکھے اس اڑنگ میں سید حامد حسن کی نیئی تال کی چھڑیاں قربان علی کے یہاں کی شیشم کی چار پائیاں اور منشی ثناء اللہ کے چینی کے برتن خاص طور پر نمایاں نظر آ رہے تھے۔

3 اپریل 1950ء

کئی مہینے ہوئے جب میں نے یہ افسانہ لکھنا شروع کیا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ اس کا یوں خون ہو جائے گا ورنہ میں تو اسے اسی وقت مکمل کر لیتا۔ افسانہ لکھتے لکھتے مجھے یہ سوجھی کہ پچھوا کا کردار افسانے میں نہیں سمائے گا۔ اس سے تو انصاف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ پورا ناول لکھا جائے میں نے سوچا کہ یوں بھی ان فسادات کی اب تک کوئی رزمیہ نہیں لکھی گئی ہے میں شاعر تو ہوں نہیں لاؤ نثر میں ہی زور ماروں۔ پھر بڑی شاعری کی تخلیق کا زمانہ تو یہ ہے بھی نہیں۔ اس عہد میں اتنے لمبے تڑنگے کردار ملتے ہی نہیں جن کے گرد کوئی رزمیہ بن جا سکے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ پچھوا جیسا کردار میرے ہاتھ لگ گیا لیکن مجھے اس دن کی کیا خبر تھی کہ قیامت ختم ہو جانے کے بعد قیامت پھر ٹوٹے گی اور پچھوا پاکستان چلا آئے گا۔ جن پچھوا نے پچھلی قیامت کو اپنے سینے پہ روکا تھا اس کے قدم اب کیسے اکھڑ گئے قادر پور پہ کیا افتاد پڑی۔ کلوا اور ممد کدھر بہہ گئے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں مجھے پچھوا سے یہ سب کچھ پوچھنے کا ہوش کہاں باقی تھا مجھے تو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرے ناول کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ میں اور پچھوا دونوں ہی بد قسمت ہیں۔ رزمیہ کا ہیرو بننا پچھوا کی قسمت میں نہ تھا اور میرے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ ڈیڑھ حرفی افسانے لکھ لکھ کر ادھ مرے چھوٹے موٹے انسانوں کی زندگی پیش کیے جاؤں۔ ممکن ہے لوگ اس بات پہ ناک بھوں چڑھائیں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھوا کوئی بڑا سپہ سالار عالیشان و شوکت والا بادشاہ نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں اک عظمت و وقار تھا۔ پھر میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ میرے ناول کو شاہنامہ کہیئے رزمیہ کا نام جمہوریہ نامہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ خیر اب تو یہ خواب ہی خیال بن کر رہ گیا۔ اس بحث میں پڑنے سے فائدہ؟

7 اپریل

زندہ چیزوں پہ لکھنے کی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں تو مردہ چیزوں پر لکھتا ہوں۔ آخر زندہ چیزوں پہ لکھا کیسے جا سکتا ہے ان میں دو اور دو چار قسم کی قطعیت ہوتی ہے ان میں مبہم گوشے اور پر معنی سائے پیدا نہیں ہوتے۔ ان پر رپورتاژ لکھے جا سکتے ہیں سیاسی نظمیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن جس چیز کو افسانہ یا شعر کہتے ہیں اس کا موضوع تو زندہ چیزیں نہیں بن سکتیں میں تو زندہ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سٹپٹا جاتا ہوں وہ نقاد بڑا سادہ تھا جس نے یہ کہا ہے کہ ادیب کو لکھتے وقت دریچے کا ایک پٹ کھلا رکھنا چاہئے۔ آندھی کے وقت دریچے کے پٹ کھولنا کس نے بتایا ہے اور مجھے تو دراصل اسی پہ حیرت ہے کہ لوگ آنکھیں کھول کر کیسے لکھتے ہیں۔ میں تو آنکھیں بند کر کے لکھتا ہوں۔ موضوع جب میرے تصور میں رس بس جاتا ہے اس وقت میں قلم اٹھاتا ہوں۔ لیکن وقت یہ ہے کہ جب تک وہ میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے وہ میرے تصور میں نہیں بستا۔ قادر پور میں مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ پچھوا ایک کہانی کا کردار بن سکتا ہے۔ پاکستان آکر قادر پور سے میرا ناتا ٹوٹ گیا اور وہاں کی فضا وہاں کے لوگ میرے لئے افسانہ بن گئے۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ پچھوا زندہ ہے یا مر گیا۔ میرے لئے تو وہ مرا برابر تھا آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل میں نے اسے مردہ تصور کر کے لکھنا شروع کیا تھا لیکن اب وہ گوشت پوست کی تصویر بن کر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ کردار جو میرے تصور میں بسا ہوا تھا وہ یوں غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ برا ہو واقعی زندگی کا جس نے مجھ سے میرے ناول کا کردار چھین لیا۔

12 اپریل

میں اپنا ناول لکھوں یا نہ لکھوں اس سوال نے میرے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی ہے کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہٹاؤ لکھنا شروع کر دوں۔ آخر لوگ زندہ موضوعات پر لکھتے ہی ہیں۔ اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں اگر میں بھی ننگا ہو گیا تو کون سی قیامت آجائے گی لیکن میں سوچ کر ہی رہ جاتا ہوں عقل میرے ساتھ ہے لیکن دل نے ستیہ گرہ کر رکھی ہے جو کردار میں نے اتنی مشکل سے تعمیر کیا تھا وہ کردار ہی سلامت نہیں ہے لکھوں کیا خاک۔ کردار کو جانے دیجئے مجھے تو وہ زندہ شخصیت بھی سلامت نظر نہیں آتی۔ قادر پور میں مشکل سے تعمیر کیا تھا وہ کردار ہی سلامت نہیں ہے لکھوں کیا خاک۔ کردار کو جانے دیجئے مجھے تو وہ زندہ شخصیت بھی سلامت نظر نہیں آتی۔ قادر پور میں تو پچھوا کی زندہ شخصیت بھی افسانے کا کردار نظر آتی تھی لیکن یہاں آکر اس میں کچھ نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے پچھوا کو ہمیشہ غم عشق میں مبتلا پایا تھا۔ اسی انداز میں میں نے اپنے ناول کے کردار کا تصور کیا تھا۔ لیکن اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ وہ غم عشق سے زیادہ غم روزگار میں مبتلا ہے آج صبح پچھوا مجھے ملا تھا کہنے لگا میاں کہیں کام وام دلوا دو سالی اب تو پاؤں ٹکانے کی

جگہ نہیں اے۔ بابو کس کام آؤ گے اور نہیں تو کوئی گھر ہی الاٹ کرادو

پچھوا کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ قادپور میں اس کے سامنے کبھی رہنے اور کھانے کا سوال کھڑا نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہاں آ کر وہ کھانے کو روٹی مانگتا ہے اور سر چھپانے کو چھت چاہتا ہے میں اسے مکان اور ملازمت کہاں سے دلاؤں میں تو بس اسے اپنے ناول کا ہیرو بنا سکتا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اسے بیسویں صدی کا ٹیپو سلطان بنادوں لیکن اب تو وہ بات ہی ختم ہوگئی۔ وہ پاکستان چلا آیا اور پاکستان آ کر وہ پاؤں ٹکانے کے لئے جگہ اور پیٹ بھرنے کے لئے روٹی مانگتا ہے اس کے کردار کی ساری بلندی اور عظمت خاک میں مل چکی ہے۔

17 اپریل

پچھوا تلاش معاش میں سرگرداں ہے آج وہ اسی چکر میں نعیم میاں کے پاس گیا تھا۔ لیکن نعیم میاں اب وہ پہلے والے نعیم میاں تھوڑا ہی ہیں۔ اب تو وہ کالے آدمی سے بات نہیں کرتے۔ انہوں نے پچھوا کو ڈانٹ دیا اماں جسے دیکھو اٹھائے ٹکٹ پاکستان کی طرف چلا آتا ہے گویا یہاں ان کے باداجی نے روکڑا داب دی ہے ذرا نہیں سوچتے کہ پاکستان میں گنجائش کم ہے۔

پچھوا کو شکایت ہے کہ نعیم میاں پاکستان میں آ کر اترانے لگے ہیں۔ اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔ وہ ٹھہرے شہ کے مصاحب۔ وہ نہ اترائیں گے تو پھر کون اترائے گا ظاہر ہے کہ ایسی کڑوی بات پچھوا قادرپور میں نہیں سن سکتا تھا اور قادرپور میں نعیم میاں کی یہ مجال ہو بھی کب سکتی تھی کہ پچھوا کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتے۔ وہاں تو اس کے سامنے ان کی سٹی گم رہتی تھی لیکن اپنے گھر پہ چیونٹی بھی شیر ہوتی ہے ظاہر ہے پاکستان میں نعیم میاں کا گھر ہے پچھوا کا گھر نہیں ہے۔

20 اپریل

رسی پوری جل چکی ہے لیکن بل باقی ہیں پچھوا کا سارا ٹھاٹ ختم ہوگیا لیکن اس کی شاعر مزاجی نہ گئی۔ وہ غم روزگار میں بھی غم عشق کی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ پاکستان کے کھیت پاکستان کی زمینیں دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئی ہیں۔ مجھ سے کہنے لگا کہ میاں ایک بیگھہ زمین کہیں سے مل جائے پھر دیکھو پچھوا کیا رنگ لائے ہے۔ بس جی آموں کا باغ لگاؤں گا اور ایک طرف اکھاڑہ کھدوادوں گا وہاں زور ہوا کریں گے۔ میاں برسات کو ادھر آیا کہ یو وہ وہ آنا کھلاؤں گا کہ ملیح آباد کو بھول جاؤ گے۔

میں نے جواب دیا۔ ابے شیخ چلی ایک بیگھہ زمین تجھے کون دے دے گا یہ زمین ہماری تمہاری نہیں ہے زمینداروں کی ہے۔

لیکن جب پچھوا بہکتا ہے تو زمین پہ قدم تھوڑا ہی رکھتا ہے۔ بولا زمیندار بھی تو اپنے مسلمان بھائی ہیں اماں جس کو اللہ رسول کا

واسطہ دوں گا وہی ایک نوالہ میں دے دے گا۔ لیجئے پچھوا نے یہ نرالی منطق نکالی ہے زمیندار بھی ہندو مسلمان ہونے لگے۔

22 اپریل

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق کار مجھ میں کم ہوتی چلی جارہی ہے کبھی اس کا الزام میں اپنے آپ کو دیتا ہوں اور کبھی خارجی حالات کو جب بھی میں قلم اٹھاتا ہوں پاکستان زندہ باد' کا نعرہ اتنی شدت سے بلند ہوتا ہے کہ میرے ہاتھ سے قلم گر پڑتا ہے۔ چاروں طرف تعمیری ادب کا شور برپا ہے۔ اس شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ جانے یہ تعمیری ادب' کس جناور کا نام ہے۔ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ میں نے ادب میں آج تک کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جو تخریبی ہو جب ادب تخریبی نہیں ہوتا تو تعمیری کہاں ہو جائے گا ادب نہ تو تعمیری ہوتا ہے اور نہ تخریبی ہوتا ہے وہ تو بس ادب ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست جب تعمیری ادب کا ذکر کر کے میرا دماغ چاٹ گئے تو میں بھن گیا میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تو امرد پرستی کے میلان پر لکھنا چاہتا ہوں۔ اس پر وہ بہت بگڑے اور کہنے لگے یہ تو بڑا امریضانہ میلان ہے۔

وہ تو پھر صحت مند موضوع آپ بتا دیجئے۔ میں نے جل کر کہا۔

وہ بولے کہ پاکستان پر لکھئے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں پاکستان پر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں؟ پاکستان تو زندہ حقیقت ہے حقیقتوں کو افسانہ بنانا میرے بس کی بات نہیں ہے پاکستان حقیقت ہے۔ قادر پور افسانہ بن گیا ہے۔ میں یہ افسانہ سنا سکتا ہوں۔ پاکستان کی زمین میں رنگ بھرنے کی سکت مجھ میں نہیں ہے۔ قادر پور میں رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں ہے وہ خود افسانہ ہے۔ اس کی دھرتی اس دھرتی کے سپوتوں کے خون سے لال ہو رہی ہے۔ وہاں کی لال زمین وہاں کی چیخوں سے لبریز فضا وہاں کے جلے ہوئے مکان وہاں کی مسمار مسجد وہاں کا اجڑا ہوا اکھاڑا یہ سب چیزیں آٹھ صدیوں کی کہانی سنا رہی ہیں۔ میں یہ کہانی پورے دے دوسوز کے ساتھ سنا سکتا ہوں۔ اور اس مہابھارت کے تھکے ہوئے ارجن کے کارنامے پورے جوش کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ ارجن میرے لئے اس وقت سب سے بڑی الجھن ہے میں قادر پور کی مہابھارت کیوں کر لکھوں۔ اس مہابھارت کا ارجن تو ناکامی کی تصویر بن کر پاکستان کے گلی کوچوں میں گھوم رہا ہے اس مکان کی تلاش ہے وہ روزگار رہتا ہے یہ دونوں چیزیں اسے نہیں ملتیں اور وہ اپنے مقام سے گرتا چلا جا رہا ہے۔

2 مئی

میاں یہ کیسا حکم آیا ہے پچھوا کو جلال آ رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ میری بوٹیاں چاب ڈالے گا۔ میں کانپ گیا۔ اس وقت

میرے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ یہ قادر پور نہیں ہے پاکستان ہے۔ یہاں پچھوا کے وہ دم خم نہیں ہیں۔ میں نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ کیسا حکم۔ پچھوا نے ترنخ کر کہا یہی حکم جو جو مہاجرین آیا ہے وہ پھر اپنی ایسی تیسی کرا کے ہندوستان چلا جائے۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں نے بمشکل اپنے حواس بجا کئے اور سمجھایا کہ بھائی غصہ تھوک دو۔ بات یہ ہے پاکستان میں تو اب تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ نئے مہاجرین کہاں سے سمائیں گے اور پھر ابھی کچھ بڑے بڑے لوگ دلی گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں ہندوستان میں سب مسلمان راضی خوشی ہیں۔

اس پہ پچھوا اور بھی بھنایا۔ میاں میں جو قادر پور سے آیا ہوں تو میں جھوٹ بولوں ہوں۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ پچھوا جھوٹا نہیں ہے۔ اس میں ہزار عیب سہی لیکن اس نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ لیکن ایک میرے جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا تو بڑے لوگوں کی بات کا اعتبار کرے گی۔

3 مئی

زمین کیسے سکڑ جاتی ہے۔ غذا کا توڑ کیوں پڑ جاتا ہے اس کی وجہ معمولی ہے لیکن اگر پچھوا کی عقل ہی موٹی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں سنتے ہیں اگلے زمانے میں ایک راجہ تھا۔ شکار کھیلتے کھیلتے وہ دور نکل گیا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جم گئیں سامنے ایک باغ نظر آیا۔ دم لینے کے لئے وہ اس باغ میں ٹھہر گیا اور باغبان سے پانی مانگا۔ باغبان کی لڑکی ایک انار توڑ لائی۔ اس کا آدھا ٹکڑا اس نے گلاس میں نچوڑا۔ گلاس لبالب بھر گیا۔ بادشاہ نے انار کا عرق پیا تو اس کے حواس بجا ہوئے۔ وہ پھر شکار کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس باغ میں اتنے انار ہوتے ہیں اور انار بھی وہ کہ اس کے ایک آدھے ٹکڑے سے گلاس بھر جاتا ہے کیوں نہ اس پہ ٹیکس لگایا جائے۔ راجہ گھومتا پھرتا پھر اس باغ میں پہنچا اور باغبان سے پانی کی درخواست کی۔ باغبان کی لڑکی نے گلاس میں ایک انار نچوڑا۔ پھر دوسرا نچوڑا لیکن گلاس اوپر تک پھر بھی نہ بھرا۔ وہ بے تحاشا چلا اٹھی۔ بابا ہمارے راجہ کی نیت بگڑ گئی راجہ بہت ٹپٹایا پوچھنے لگا تم نے کیسے جانا کہ راجہ کی نیت بگڑ گئی باغبان بولا مہاراج جو راجہ کی نیت بگڑ وے ہے تو فصل میں ٹوٹا آ جاوے ہے۔ اس معمولی سی بات سمجھنے کے لئے کسی بہت بڑے دماغ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بات کو جاہل لٹھ باغبان سمجھتا تھا اور اس کی بیٹی بھی جانتی تھی لیکن پچھوا کے دماغ میں تو گوبر بھرا ہوا ہے۔

4 مئی

پچھوا کہتا ہے میاں مجھے ایک دن کے لئے پاکستان کا بادشاہ بنا دو۔ پھر دیکھو یاروں کو کیا تگنی کا ناچ نچاؤں ہوں جنہوں کے پاس

بڑی بڑی زمینیں اور بڑے بڑے مکان اور کئی کئی کارخانے ہیں انہیں مار مار کے اتو کر دوں گا اور جو جو مہاجرین ہے سب کو دس کا حصہ دے دوں گا۔ وہ چٹکی بجاکے کہتا ہے میاں دیکھنا یوں چٹکی بجائے سب معاملہ فٹ کر دوں گا۔ لیکن مجھے اس کی بات کا اعتبار نہیں وہ ہمیشہ دون کی لیتا ہے اسے اگر پاکستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو اس کی نیت کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ ذمہ داری کا احساس تو بس غیر ذمہ دار لوگوں کو ہوتا ہے جس چیز کو غیر ذمہ داری کہتے ہیں وہ ذمہ داریوں کے ہجوم سے پیدا ہوتی ہے غیر ذمہ دار آدمی نہیں ہوتا کرسی ہوتی ہے۔

5 مئی

سیاست میں جتنا بھاگتا ہوں اتنا ہی وہ میرا پیچھا کرتی ہے۔ پچھوا جب تک پاکستان نہیں آیا تھا۔ خالص افسانوی کردار تھا لیکن یہاں آ کر وہ اچھا خاصا سیاسی مہرہ بن گیا ہے اب میں اس کے متعلق جب بھی کچھ سوچتا ہوں میرا قدم سیاست کی سنڈاس میں جا پڑتا ہے اسے مکان کیوں نہیں الاٹ ہوا اسے نوکری کیوں نہیں ملتی۔ اسے ہندوستان واپس کیوں بھیجا جا رہا ہے غرض جس پہلو سے بھی میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں میں سیاست کی بھول بھلیاں میں پھنس جاتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں سیاست پر گفتگو نہیں کر سکتا مہاجروں کی بحالی۔ اقلیتی معاہدے متروکہ جائیداد کے سمجھوتے' ان سب کے بارے میں میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں اور اگر میں نے اپنی زبان میں تالا ڈال رکھا ہے تو اس کی وجہ پاس ادب نہیں ہے۔ میں سوچتا یہ ہوں کہ میں سیاست کے پھٹے میں کیوں ٹانگ اڑاؤں مجھے خوب احساس ہے کہ میری تخلیقی صلاحیتیں سلب ہوتی چلی جا رہی ہیں لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ میں ناک پکڑ کے سیاست کے گندے تالاب میں کود پڑوں بگڑے گویے کو بگڑا گویا ہی رہنا چاہیے مرثیہ خواں نہیں بننا چاہیے۔ اگر کوئی اس پورے کرہ ارض پہ مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دے تو بھی میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔

میرا تو خارجی زندگی کے نام ہی سے دم خشک ہوتا ہے خارجی زندگی کی سب سے مکروہ شکل سیاست ہے' سیاست سے میں یوں کانپتا ہوں جیسے قصائی سے گائے کانپتی ہے اور سچ پوچھیے تو سیاست بھی ادیب کا وہی حشر کرتی ہے جو قصائی گائے کا کرتا ہے مزہ یہ ہے کہ سیاست ہی ادیب اور ادب کا ذبح کرتی ہے اور سیاست ہی کے نام ثواب لکھا جاتا ہے۔

6 مئی

میری تخلیقی لگن سرد ہوتی جا رہی ہے اور پچھوا کی شخصیت میں جو افسانویت تھی جو جادو تھا وہ زائل ہوتا جا رہا ہے مجھے تو اب وہ کسی طرف سے آدمی ہی نظر نہیں آتا۔ اچھا خاصا شطرنج کا مہرہ ہے۔ اس خانے سے پٹا تو اس خانے میں آ گیا اب اس خانے سے اسے پھر

اس خانے میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔ ایسا شخص میرے ناول کا ہیرو کیوں کر بن سکتا ہے ناول کے کردار تو آدمی ہوا کرتے ہیں۔ اگر میں نے مار پیٹ کر کے ایسا ناول لکھ بھی ڈالا جس کے کردار شطرنج کے مہرے ہوں تو اس ناول کی وقعت معلوم شطرنج کے مہروں پہ جو ناول لکھا جائے گا وہ شطرنج کی چال کے سوا اور کیا کہلائے گا۔

7 مئی

میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس کا جلال عارضی ہے لیکن وہ واقعی چلا گیا۔ وہ چیز جسے ضمیر کہتے ہیں بڑی بے حیا چیز ہے۔ وہ مرتا مرتا نہیں ہے ادھر مرا ہو جاتا ہے یا مکر بھر کر پڑ جاتا ہے۔ کسی وقت بھی اس میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس نے مجھ سے بڑے غصہ میں پوچھا لیڈر لوگ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔

میں نے ہنس کر کہا کہ وہ چلے گئے تو پاکستان میں لیڈری کون کرے گا؟

اس بات پہ وہ بکھر پڑا اور نعیم میاں کو بے نقط سنا ڈالیں۔

میں نے پچھوا کو سمجھایا تھا کہ اگر تمہیں جانا ہی ہے تو ذرا تھم کے جانا حکومت اپنی طرف سے تمہارے سفر کا انتظام کرے گی۔ اس پہ وہ اور بھنایا کفن کے پیسے یاں سے لیں اور قبر ہندوستان میں جا کے بنائیں۔ خیرات کا کفن ہمیں نہیں چاہیئے۔

8 مئی

پچھوا کے چلے جانے کے وجہ سے میرے ناول کے منصوبے میں پھر جان پڑ گئی ہے لیکن کیا خبر ہے کہ وہ پھر واپس آ جائے اور میرا بنا بنایا کھیل پھر بگڑ جائے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ موت کی نذر ہو جائے۔ آخر انسانی زندگی ایسی پائیدار چیز تو نہیں ہے۔ آدمی کا دم پٹ سے نکل جاتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ آبے کے اس باسی کو سندھ کی گرمی لے بیٹھے۔ ممکن ہے کوئی اسے اٹھا کر ریل سے باہر پھینک دے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ریل پر حملہ ہو جائے مختصر یہ کہ موت کو تو بہانہ چاہئے اللہ میاں چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا اور انسانوں کی ہلاکت تو خاصا دلچسپ مشغلہ ہے۔

20 مئی

پچھوا کو گئے ہوئے ایک پندرواڑہ ہونے کو آیا۔ قادر پور میں اب اور تو کون بیٹھا ہے لیکن سنا ہے کہ صوبیدار صاحب وہاں سے ابھی نہیں ملے ہیں۔ انہیں خط ڈالا تھا لیکن جواب ندارد ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ شخص سندھ کی خاک پھانکتا کدھر نکل گیا مجھے تو یہ ماننے میں بھی تامل ہے کہ اس نے سرحد عبور کر لی ہے کیا عجب ہے اسے سندھ کی خاک پسند آ گئی ہو یا ممکن ہے پاکستان کی دھرتی ہی نے روٹھ

کر جانے والے مہمان کو سینے سے لگالیا ہو۔ اپنے وطن کے سپوتوں کا نہ سہی اپنے وطن کی زمین کا دل ضرور دھڑکتا ہے۔ اپنا یہ نیا وطن بھی خوب ہے اور اس کے بن بلائے مہمان بھی خوب ہیں۔ بن بلائے مہمانوں کو بھیری یاران وطن کا گلہ ہے۔ یاران وطن کو شکایت ہے کہ ناعاقبت اندیش مہمانوں کو میزبانوں کی مشکلات کا احساس نہیں ہے وطن میں جگہ ہو یا نہ ہو وطن والوں کے دل میں جگہ نہیں رہی اور اس لئے پچھوا چلا گیا پچھوا اکڑ کر چلا گیا وہ کہتا تھا اب یہاں رہنا اپنی بے عزتی ہے۔ اپنی جھوٹی آبرو کا یہ سچا پاسبان کدھر نکل گیا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ شخص بھی کس قدر انفرادیت پسند تھا۔ اسے اپنی نجی پگڑی سنبھالنے کی فکر دامن گیر تھی مجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنی پگڑی سنبھال سکا یا نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب پوری قوم کی پگڑی اتر رہی ہو تو پھر فرد کی پگڑی کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ رہے رہے نہ رہے نہ رہے۔

21 مئی

روز کا ڈاکیہ کا رستہ دیکھتا ہوں۔ دروازے پہ نگاہیں لگی رہتی ہیں ڈاکیہ آتا ہے اور ایک چھوڑ کئی کئی خط لاتا ہے لیکن جس خط کا انتظار ہے وہ خط نہیں آتا۔ صوبیدار صاحب کو کیا ہو گیا جو جواب نہیں دیتے۔ کیا وہ بھی چل بسے۔ آدمی کے دام کا کیا سہارا اور صوبیدار صاحب تو یوں بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور اس مرد پچھوا کو کیا ہو گیا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل لیا۔ ہوائیں اڑ کر لے لی گئیں یا سانپ نے ڈس لیا۔ آدمی کی بساط ہی کیا ہے بتاشے کی طرح بیٹھ جاتا ہے لیکن پچھوا تو اپنے زعم میں چراغ لے کے ہوا کا مقابلہ کرنے نکلا تھا۔

23 مئی:

یہ رات یہ جہاں یہ خانہ غم یہ جام یہ دور
کہاں پہ چراغ جلائے ہیں لوگ اے ساقی

لیجیے وہ شخص واقعی چلا گیا اور ایسا گیا کہ پاکستان سے کوسوں دور نکل گیا وہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کی سرحدوں کو عبور کرتا اس سرزمین کی سرحد میں جا نکلا جس کا اور چھور نہیں ہے جہاں وہ روز ان گنت مہاجرین ٹوٹتے ہیں اور پلک جھپکتے آباد ہو جاتے ہیں۔ صوبیدار صاحب کا خط آیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے خط ہی کہوں یا مرثیہ معلوم نہیں صوبیدار صاحب قازوں اور ہرنوں کا شکار کرتے کرتے مرثیہ کب سے لکھنے لگے لکھتے ہیں۔

تمہارا خط دیر سے ملا لیکن شکر ہے کہ مل گیا ملنے میں تاخیر دو وجوہ سے ہوئی ایک تو یہ کہ اس کا پتہ ایسی زبان میں لکھا ہوا تھا جس کے

جاننے سے یہاں میرے سوا باقی سب کو انکار ہے دوسری بات یہ ہے کہ قادر پور اب قادر پور نہیں رہا۔ اس بستی کے نئے باسی اسے اب جاٹو نگر کہتے ہیں۔

تم نے بے تحاشا سوال کر ڈالے ہیں۔ میں کس کس کا جواب دوں اور کیا جواب دوں بھائی تم کس زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ اب قادر پور کہاں ہے؟

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

یہاں اب نہ کوئی ٹنڈا پہلوان ہے نہ کوئی اللہ راضی ہے نہ عید گاہ والے پیپل پہ اپنا جھنڈا لہرانے والے لوگ ہیں جب قادر پور کی زمین قادر پور والوں پہ تنگ ہوئی تو کچھ لوگ تو اس زمیں میں سما گئے اور کچھ اس زمین سے باہر ہانک دیئے گئے تم جولا ہوں والی مسجد کے پیچھے والے اکھاڑے کا حال پوچھتے ہو اور مجھے اس مسجد کے وجود میں ہی شبہ ہے مسجدیں نمازیوں کے نہ ہونے پہ مرثیہ خوانی تو کریں اور اکھاڑے اپنے پٹھوں کے بچھڑ جانے پہ صف ماتم بھی بچھائیں لیکن وہ کہیں باقی بھی ہوں۔ اللہ راضی کی دکان؟ تمہارے یاد دلانے سے یاد آیا لیکن وہاں تو اب جھٹکے کا گوشت بکتا ہے۔

تمہارے وطن میں پچھوا کے لئے جگہ نہ تھی لیکن اس پرانے وطن کی دھرتی نے اسے اپنی چھاتی سے لگالیا۔ میں اس نصیب ور شخص سے نہ مل سکا۔ ہاں ایک روز جب ساری بستی میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ عید گاہ والے پیپل کی جس شاخ پر کلو اور ممد نے اپنی پارٹی کا جھنڈا باندھا تھا وہاں اب ان کے سردار کا سر لٹک رہا ہے۔

تمہارا خط پڑھ کر عجیب کیفیت ہوئی تم نے یاد تو کیا کسی بہانے ہی سے سہی۔ خط کے پرزے سے کبھی کبھی یاد کر لیا کرو ہم غیر تو نہیں ہیں۔

وجہ بیگانگی نہیں معلوم

تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

چراغ سحری ہوں بجھا چاہتا ہوں پھر تم قادر پور میں کسے خط لکھو گے ہاں پتے کے متعلق میں نے جو دو باتیں لکھی ہوئیں ان کا خیال رکھنا۔

صوبیدار صاحب نے عجب خط لکھا ہے یہ خط ہے یا کسی رزمیہ داستان کے اختتامیہ فقرے ہیں میں سوچتا ہوں کہ جو ناول میں لکھنے والا ہوں یعنی وہی قادر پور کی مہابھارت کیوں نہ اسے اسی خط پہ ختم کر دوں اور پچھوا دیوانے نے کیا موت پائی ہے اس کی زندگی

بھی ڈرامہ بھی اس کی موت بھی ڈرامہ ہے اس کی زندگی میں اگر کوئی غیر ڈرامائی بات ہے تو بس پاکستان کی ہجرت ہے کاش وہ پاکستان نہ آتا پچھوا نے پاکستان آ کر اپنے آپ کو رسوا کیا اور میرے ناول کے کام میں کھنڈت ڈالی۔

25 مئی

پچھوا مر گیا لیکن میرے ناول کی بات اب بھی نہ بنی۔ میں جب قلم اٹھاتا ہوں تو میرے ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا ہے مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ پچھوا کا قاتل میں ہی ہوں۔ یہ میرے دماغ میں کیا خناس سمایا تھا کہ اس کے مرنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ اگر ناول اور افسانے ایسے لکھے جایا کرتے تو ادیب روز قتل کے مقدموں میں ماخوذ ہوا کرتے۔

27 مئی

میں روز نیت باندھتا ہوں لیکن ناول لکھنا میں نے اب تک شروع نہیں کیا ہے۔ میں قلم اٹھاتا ہوں اور رکھ دیتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ میں یہ ناول کیوں لکھ رہا ہوں یہ ناول اگر میں نے لکھ لیا تو اسے کون پڑھے گا۔ یہاں لوگ انسانی جذبات کا احترام نہیں کرتے۔ انسانی جذبات کا ذکر تو پھر بعد کی بات ہے۔ ادب کا ذوق وشوق تو آدمیت کے احترام سے پیدا ہوتا ہے میری قوم آدمی کی قدر نہیں کرتی۔ ادب کا وہ خاک احترام کرے گی میں اپنی تخلیقی لگن کو رسوا کیوں کروں اور اپنے قلم کی بے حرمتی کیوں کراؤں۔

28 مئی

میں نے اب واقعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنا ناول نہیں لکھوں گا لیکن گھر پڑے پڑے چار پائی کے بان کب تک توڑے جاؤں۔ میں نے سوچا ہے کہ مجھے اب ہاتھ پیر ہلانے چاہئیں۔ مجھے لوگوں کو چونکانے کا شوق تو ہے نہیں جو کسی اپچ کا مظاہرہ کروں ورنہ غلاموں کی بدنام تجارت میں بھی شروع کر دیتا لیکن اب نجی طور پر اس کی اجازت نہیں۔ حکومتوں نے یہ کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے نعیم میاں کہتے ہیں کہ تمہیں بہت دیر میں ہوش آیا اور نہ میں کوئی بڑا کارخانہ تمہارے نام الاٹ کرا دیتا انہوں نے اب ایک پن چکی الاٹ کرانے کا وعدہ کیا ہے مجھے تو بہر صورت کام کرنا ہے کارخانہ نہ سہی پن چکی ہی سہی۔

29 مئی

نعیم میاں بہت کام کے آدمی نکلے انہوں نے کسی نہ کسی طرح میرے نام پن چکی الاٹ کرا ہی دی۔ پن چکی الاٹ ہونے کے بعد میں اپنے آپ میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ جب تک میں ادب کے چکر میں پھنسا رہا ہوں میں اپنے آپ کو اپنی قوم سے کٹا ہوا محسوس کرتا تھا۔ میں اگر ادب کے چکر میں پھنسا رہتا تو دھوبی کا کتا ہی بنا رہتا نہ تو ناول ہی لکھا جاتا اور نہ میں اور کوئی کام

کر سکتا۔ اب میں اپنے آپ کو ایک ذمہ دار شہری محسوس کرتا ہوں ایک ابھرتی ہوئی قوم کا فرض شناس فرد۔

یکم جون

آج میں آخری مرتبہ ڈائری لکھ رہا ہوں کل سے مجھے اتنی فرصت کہاں ملے گی۔ ڈائری لکھنا تو ٹھالی کی بیگار ہے۔ چکی کا انتظام درست ہو چکا ہے۔ اللہ نے چاہا تو کل سے باقاعدہ چلنی شروع ہو جائے گی۔ شہر میں اس وقت پانچ پیسے پنسیری آٹا پس رہا ہے میں نے سوچا کہ اپنے یہاں اکنی پنسیری کا بھاؤ رکھا جائے تا کہ لوگ نئی پن چکی کی طرف جلد مائل ہوں۔

◆◆◆

سانجھ بھئی چوندیس

خدا خدا کر کے ہاپوڑ آیا ٹکٹ دے کر جب میں سٹیشن سے باہر نکلا تو سامنے نیلی پیلی رکشاؤں کی قطار اور اس کے پیچھے چند ٹوٹے پھوٹے تانگے نظر آئے۔ سٹیشن پر لگی ہوئی سندھ ہندی کی تختیوں کے بعد یہ دوسری تبدیلی تھی۔ جس پہ میں بہت چونکا رکشاؤں کے گرداب سے نکل کر میں نے ایک مرتبہ پھر نظر ڈالی کہ شاید کوئی ڈھنگ کا تانگہ نظر آجائے اور جب رنگ یکساں نظر آیا تو میں اللہ کا نام لے کر اللہ دیئے کے تانگے میں بیٹھ گیا۔ اللہ دیا بہت کٹھک نکلا۔ اس نے میری باتوں سے صاف بھانپ لیا کہ میں پاکستان سے آرہا ہوں۔ میں نے بھی اس کے خیال کی توثیق کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ پاکستان کا نام سن کے اس کی آنکھیں تارا بن گئیں۔ اس نے کئی بار مجھے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور کہنے لگا کہ میاں تمہیں کچھ کچھ تو پہچان رہا ہوں پر پوری طریوں نئیں پچھانا' میں مسکرانے لگا اور اللہ دیئے نے گھوڑے کو سڑاک سے چابک رسید کیا تیری بیٹی کی ماں کی دم میں نمدا۔ ذرا چال تو دکھا میاں کو تانگے کی رفتار قدرے تیز ہوگئی اور جب تانگے کی طرف سے اللہ دیئے کو فراغت نصیب ہوئی تو اس نے مڑ کے مجھ پر پھر ایک نظر ڈالی اور بولا "اجی پاکستان میں تانگے تو خوب چلتے ہوں گے۔"

"نہ چلنے کی کیا بات ہے جیسے یہاں ملتے ہیں۔۔۔۔ وہاں بھی چلتے ہیں۔"

"اجی میاں یاں کاں پہلے ہم تو ان پیچ چماروں کی جانوں کو رو رہے ایں۔"

"یہ کیوں؟۔" میں نے چونک کے پوچھا۔

اجی وے سالے اب رشکا چلاوے ہیں۔ ان رشکاؤں نے تو اپنا ٹیبا کر دیا بابو اللہ دیئے نے ایک ذرا توقف کیا اور پھر بڑبڑانے لگا پہلے تو روزینہ سات آٹھ روپے لئے تھے پر اب تو ڈیڑھ پونے دو سے زاویئے کا بونت بنتا ہی نہیں۔ بولو جی کیا مالک کو دیں خود کھاویں کیا گھوڑے کو کھلادیں اور پیچ دانہ دادا کے مول بکے ہے۔

آسمان پہ چھائی ہوئی گھٹا کا جمود ٹوٹ چکا تھا۔ سیاہی مائل بدلیاں آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھیں ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوگئی تھی چند ایک دیہاتی مسافر اور شہر کے بنئے جنھوں نے پیدل ہی منزل پر پہنچنے کی ٹھانی تھی سڑک کو چھوڑ کر درختوں کے سائے میں چلنے لگے۔ الٹے ہاتھ پر لالہ منشی لال کی کوٹھی میں ایک گھنے آموں کے پیڑ کی شاخوں سے ایک مور کی نیلی چمکیلی گردن ابھری اور پھر ڈوب

گئی۔ سامنے سے گلّو اپنا خالی تانگہ لئے چلا آ رہا تھا پچھلی نشست پہ بیٹھ کر اس نے اپنی ٹانگیں اگلی نشست پہ ڈال رکھی تھیں اور بہت مزے میں اور اپنے گلے کی پوری قوت سے وہ یہ مصرعہ بار بار دہرا رہا تھا۔

تقدیر ہی بن کر بگڑی دنیا نے ہمیں برباد کیا

ان کا تانگہ جب ذرا قریب آیا تو اس نے گانا یکایک بند کر دیا اور اللہ دیئے مخاطب ہوا ''ابے اللہ دیئے کون سی گاڑی کری آیا۔''

''میرٹھ کی۔'' اللہ دیئے نے گلّو کے سوال کا جواب دینے کے بعد ایک لحمہ توقف کیا اور پھر بولا بھٹو دیکھے کیا ہے پاکستان کی سواری لا ریا ہوں۔

پاکستان کی سواری کے جملے سے گلّو ابہت مرعوب ہوا۔ اس کا تانگہ آگے بڑھ گیا تھا اس نے کئی مرتبہ مڑ کے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا ڈور کا ٹوٹا ہوا سرا اس نے پھر پکڑا اور بے سری تان الاپی

اے عشق کے ماتو تم ہی کہو انجام مرکیا ہونا ہے

گلّو کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی اس وقت اپنا تانگہ تحصیل سے آگے نکل آیا تھا۔ میرٹھ بلند شہر کی لاری بھری کھڑی تھی اور ایک بڈھا کھڑا بے تحاشا چلا رہا تھا۔ چل بین شیر کو۔ گاڑی چھوٹ گئی۔ اللہ دیئے نے کچھ کہنے کے انداز میں میری طرف مڑ کے دیکھا اور پھر گھوڑے کی طرف دیکھنے لگا تھوڑی دیر بعد وہ یکایک میری طرف مڑا اور بولا اجی ہمارا یاں کیا بنے گا یہ سوال کچھ اس قدر غیر متوقع طور پر کیا گیا تھا کہ میں سٹپٹا گیا کم از کم اللہ دیئے سے مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی لیکن اللہ دیئے نے مجھ سے یہ سوال کر ہی ڈالا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کا جواب کیا دوں۔ میں نے جلدی جلدی کئی جواب سوچے اور پھر انہیں روک دیا بلند شہر کی لاری چھوٹ چکی تھی۔ اس وقت وہ دور درختوں کی آغوش میں گم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ سڑک خاموش تھی بس ایک گھوڑے کی چاپ اور تانگہ کی کھڑکھڑاہٹ کا ملا جلا شور تھا جو اپنی یکسانیت کے باعث خود خاموشی کا جز بنتا چلا جا رہا تھا۔ اللہ دیلا اپنے سوال سے بے تعلق ہو کر گھوڑے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔

بلند شہر کی سڑک سے مڑ کر تانگہ نئی آبادی میں داخل ہو گیا۔ نئی آبادی پرانا بازار محلہ قانونگویاں اور پھر قاضی واڑہ مجیدن دھوبن دروازے پر کھڑی تھی مجھے دیکھ کے کھل گئی۔

''ارے انجا ر آ گیا۔ لالہ تو توبت ہار گیا۔'' اور پھر اس نے گریز کیا مگر بھیا پاکستان میں کیوے ہیں کہ ناج بڑا ستا ہے تو کیوں ہار گیا ارے تجھے مرے سر کی سوں سچ سچ بتا ئیو پاکستان میں ناج کا کیا بھاؤ ہے۔''

بڑی بی پاکستان میں اناج بہت سستا ہے میں اسے جواب اور کیا دے سکتا تھا۔ صحیح زخوں کا پتہ کسے تھا اور پھر یہ کب خبر تھی کہ ہندوستان میں مزاج پرسی کے فوراً بعد گیہوں کا بھاؤ پوچھا جاتا ہے سامنے گلی میں سکھیا چماری پیڑھی پر بیٹھی بڑی یکسوئی سے اپنے لہنگے کے نیفے کی جوئیں بن رہی تھی۔ پاکستان اور ناج کے لفظوں پہ اس کے کان کھڑے ہوئے اور پھر قدرتی طور پر وہ مجیدن دھوبن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سکھیا کی بیٹی اپنے گھر کی کچی دیوار پہ سیڑھی لگائے کھڑی تھی اس کا لونڈا دیوار پہ ٹکا ہوا تھا اور اپنی چھاتیاں اس کے سپرد کر کے وہ اس قدر بے نیاز ہوگئی تھی۔ گویا ان سے اب اس کا کوئی تعلق ہی باقی نہیں ہے۔ سکھیا کی بیٹی کی چھاتیاں اب بہت مضمحل ہوگئی ہیں لیکن اس کے پیٹ کی شادابی اب بھی باقی ہے وہ اس وقت موسم پر گفتگو کر رہی تھی اور اس کی پیشین گوئی کے مطابق دوسرے دن واقعی بارش ہوئی لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس میں سکھیا کی بیٹی کا کیا کمال ہے۔ سلونوں پہ بارش ہوتی ہی ہے لہٰذا اس پیشگوئی سے یہ ثابت تو نہ ہوا کہ سکھیا کی بیٹی کا عناصر قدرت کی نبض پہ ہاتھ ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجئے کہ اسے سلونوں کی اس ریت کا گہرا احساس تھا۔ یو۔ پی میں دراصل برسات محض عناصر قدرت کا کھیل نہیں ہے اس میں آدمی کی طبیعت کو بھی خاصل دخل ہے جسے برسات کہتے ہیں وہ محض مینہ برسنے سے عبارت نہیں ہے۔ وہ ایک فضا ہے' ایک روایت ہے' آموں کے نوروز' نیم کے پیڑوں میں پڑے ہوئے جھولوں کالی گوری کلائیوں میں بندھی ہوئی راکھیوں اور آلھاوؤں کے بغیر بھلا برسات کا تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے اور بادل گھر کے آئیں گے تو جنگل میں مور ضرور بولے گا پھر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جھما جھم بوندیں پڑیں اور بازاروں میں لال پیلے آموں کے ٹوکرے نظر نہ آئیں۔ دراصل یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ جہاں آموں کے باغ نہیں ہوتے۔ وہاں بارش کیوں ہوتی ہے پال کے آم کھانے میں ایسا کچھ مضائقہ تو نہیں ہے آخر ادھیڑ عمر کی بیواؤں سے بھی لوگ شادی کرتے ہی ہیں لیکن ٹپکا نظر تو آنا چاہئے۔ یہ بات ہم نے لاہور آن کر ہی دیکھی کہ ٹپکا دوا کو نہیں ملتا اور پال کے آم پھلوں کی دکان پہ بکتے ہیں۔ پھل فروشوں یوں تو کچھ بھی بیچ سکتے ہیں لیکن پھلوں کی صف میں رکھے جانے سے ایک تو آم کی انفرادیت مجروح ہوتی ہے اور پھر یہ کہ انہیں پھلوں کی دکان پہ دیکھ کے قلت اور ناداری کا احساس پیدا ہوتا ہے آخر غالب نے جو آموں کے ساتھ بہت سے ہونے کی شرط لگائی تھی۔ وہ۔ ندیدا پن تو نہیں تھا آموں کی فصل بھی لیسی ہوئی کہ ہاپوڑ کی منڈی کا رنگ گندمی سے سندوری ہوگیا اور گلیاں گٹھلی چھلکوں سے پٹ گئیں۔ لیکن میں جب پہنچا تو بارات گزر چکی تھی خیر برسات کا دھوم دھڑکا ابھی باقی تھا۔ برسات بھی اپنے اجڑے وطن میں اس سال ایسی ہوئی کہ رہے نام سائیں کا۔ سورج تو کبھی کبھار ہی اپنی صورت دکھاتا تھا۔ بس ایک شاداب دھوئیں کی چادر فضا میں معلق تھی۔ بوندا باندی ہوئی اور بند ہوگئی' کبھی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی اور کبھی اندھیری دیکھے گھٹا آئی اور مینہ کی ایک جھڑی پڑ گئی۔ سلونوں کے دن صبح منہ اندھیرے

مینہ کا ایک چھینٹا پڑا اور سلونوں کی آمد کی اطلاع دے گیا پھر سارے دن ایک بوند نہیں پڑی البتہ ابر حسب دستور چھایا رہا۔ شام کو بازار میں نکلے تو خدا کی قدرت نظر آئی خلق خدا کا اژدہام۔ مجمع خاص و عام تھا۔ بزانے میں کھوے سے کھوا چلتا تھا' پاؤں پھسلتا تھا' مینہ بوندی کے دن' پھر شربت کی سبیلیں' ذرا دھیان بٹا پاؤں رپٹا ہم نے اس مجمع میں لوگوں کو دوسرے انداز سے بھی پھسلتے دیکھا۔ بہت جی خوش ہوا جدھر نظر کرتے تھے نگاہ پھسلنے لگی تھی ماتھے پہ بندی ہاتھوں میں مہندی' مانگ میں سیندور دل کا سرور' جھانجنوں کی جھنجھناہٹ' چوڑیوں کی کھنکھناہٹ' کسی کی چولی کھسکی ہے کسی کی پریشان لٹ ماتھے پہ آ پڑی ہے کوئی ریل پیل اور دھکم دھکا دیکھ کر بدکتی ہے کوئی ارے ہوئے نوجوانوں کو دیکھ کر سمٹتی ہے کوئی کیچڑ سے اپنی ساڑھی بچائی ہے' کوئی بھیا کو گود میں لادے چلی جاتی ہے منڈی میں اور ہی گل کھلا تھا گلبدنوں کا ایک جلوس سامنے سے چلا آتا تھا خلق خدا کی کثرت تھی نور کا وفور تھا کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا' ایک پہ ایک گرتی تھی ساری کے پلوؤں سے دامن بچا کر چلنا دشوار ہو گیا تر دامنوں نے خوب دامن پھیلائے تنگ دامانی کی شکایت کرنے والے بھی دامن دراز بن گئے۔

کھڑکی بازار میں خلقت ٹوٹی تھی۔ ہزاری بزاری' مٹھائی کی تھالوں کی جھنکار' میوہ فروشوں کی پکار' دلالوں کی بول چال دنیا جہان کا اسباب و مال صرافوں کے مقابل صراف دکانیں صاف شفاف' اجلی اجلی چاندنیاں بچھی تھیں۔ پٹے پھٹتے تھے پیسے کھنکتے تھے حلوائیوں کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ کوئی گلاب جامنیں مانگتا ہے کوئی برفی اور امرتی کا غل مچاتا ہے اور مٹھائیوں کی کثرت کا یہ عالم کہ چوکیوں کی سیڑھیاں بلند ہوتے ہوتے دکانوں کے چھجے سے جا لگی ہیں اور ہر سیڑھی پر رنگ برنگی تھالیں چنی رکھی ہیں۔ دکانوں سے ہٹ کر سڑک پر نظر ڈالئے تو بھیڑ میں ہر طرح کے چہرے نظر آئیں گے پلپلی توندیں کالے بھجنگ چہرے' سنڈے مسٹنڈے پھریرے بدن' گورے ماتھوں پہ تلک کی زرد لکیریں' نرم نرم کلائیوں میں راکھیاں' سفید بگلا سی دھوتیاں کوئی مٹھائی کے دونے خرید تا ہے کوئی دہی بڑوں کا پتا کھڑا چاٹتا ہے کسی کو دیکھ کے لوگ ہونٹ چاٹتے ہیں۔ کوئی نگاہ بازوں سے آنکھ چراتا ہے۔ کوئی فقرے بازوں سے کتراتا ہے کھیلے کھائے جیبوں کو تاکتے ہیں گلوریاں چباتے ہیں اور ہنسی خوشی گلے ملتے ہیں۔ ناتجربہ کار سہمے ہوئے ہیں' ہونٹوں پر پپڑی جمی ہے' دل دھڑ دھڑ کرتا ہے' ہم دراصل اس وقت اکیلے تھے ریوتی ہمیں اکیلا چھوڑ کر دلی چلا گیا تھا اور یوں بھی اپنا یہ دیار اب دیار غیر بن گیا تھا۔ اس لئے دل اندر سے دھکڑ پکڑ کر رہا تھا تو کون سی عجیب بات تھی بہت دیر کے بعد ہاتھ پیروں میں گرمی آئی لیکن ایک آشنا صورت کو دیکھ کے ہم نے پھریری لی ہی تھی کہ پیچھے سے سید صاحب نے آن دبایا۔ ''اماں تم یہاں کہاں کب آئے' کدھر سے آئے۔'' ہم بہت سرد ہوئے۔ طبیعت بجھ گئی ساری تفریح پہ پانی پڑ گیا۔ الٹے سیدھے جواب دے کے ہم نے کئی کاٹنی چاہی۔ لیکن وہ ان اڑان

گائیوں میں بھلا کب آتے تھے۔ ایک نہ مانی' گھسیٹ کے اپنی بیٹھک میں لے گئے۔

بیٹھک میں پہنچتے ہی سید صاحب نے سوال کیا کہ بھئی جنگ کب ہو رہی ہے؟ میں بہت تپا کہ اللہ اللہ اب ہماری یہ اوقات ہوگئی کہ روس اور امریکہ کی سیاست پر بحث کریں میں نے ہر سرد مزاجی سے جواب دیا کہ جی ہاں کوریا کے حالات کچھ بگڑتے تو نظر آتے ہیں۔

وہ تڑے بولے اماں کوریا کو گولی مارو میں پوچھتا ہوں پاکستان کا حملہ کب ہو رہا ہے؟

پاکستان کا حملہ؟ کہاں؟ میں بھونچکا رہ گیا۔

کہاں؟ یہاں اور کہاں؟ دراصل سید صاحب میرے چونکنے پہ بہت چونکے اور پھر انہیں اس بات کا بھی ملال ہوا کہ یہ شخص پاکستان میں رہ کے پاکستان کے عزائم سے اس قدر بے خبر ہے۔ لیکن انہیں میری طرف سے ناامید ہو جانا بھی گوارا نہ تھا پاکستانی لاکھ کودن اور کذھب سہی بہر حال وہ پاکستانی ہے سو انہوں نے مجھے شاہ نعمت اللہ کی پیشین گوئی سنائی اور تازہ سیاسی حالات کی روشنی میں اس کی صداقت کے امکان پہ بحث کی لیکن اس پر بھی جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو پھر وہ لپک کر اندر گئے اور ایک پرانی دہرانی جنتری اٹھا لائے لو صاحب میری بات کا تمہیں اعتبار نہیں لیکن اب یہ تحریری شہادت موجود ہے اب کیسے انکار کرو گے یہ 23ء کی جنتری ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ 50ء میں پورے ہندوستان پہ مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

منشی نور الحق جانے کس وقت آن بیٹھے تھے لیکن اب تک وہ بہت خاموشی سے حقہ پینے میں مصروف تھے لیکن گفتگو جس منزل پہ آ گئی تھی۔ یہاں غالباً ان کا دخل دینا ضروری ہو گیا کوئی قبضہ وبضہ نہیں ہوگا اور پھر حقہ کی نے اختلاط میں مصروف ہو گئے۔ ایک ان کی قنوطیت پسندی اور پھر اوپر سے اتنے اہم موضوع ہے اسے قدر بے اعتنائی سید صاحب کے پتنگے لگ گئے بولے کہ کیسے قبضہ نہیں ہوگا۔

منشی نور الحق نے حقہ پیتے پیتے اسی بے اعتنائی سے جواب دیا کہ بس ہم نے کہہ دیا کہ قبضہ نہیں ہوگا۔

سید صاحب اور جھنجھلائے صاحب کیسے قبضہ نہیں ہوگا۔

اچھا تو قبضہ کر لو تم اکتوبر کو کہہ رہے ہو جاؤ ہم نے تمہیں دسمبر تک کا وقت دیا۔ دسمبر؟ تاریخ کے التوا پر سید صاحب کو غصہ آنا ہی چاہیے تھا انہوں نے چیلنج کا جواب چیلنج سے دیا دسمبر تک تو میاں میں تمہیں امن دکھانا چاہتا ہوں۔ منشی نور الحق اپنی سابقہ روش سے اک ذرا ہٹ کر کچھ ہنسے کچھ متعجب ہوئے اتنے بڑے ملک میں دسمبر تک امن بھی دکھا دو گے۔

سید صاحب نے تنک کر جواب دیا ہاں ہاں دسمبر تک امن دکھائیں گے ایک دفعہ قبضہ ہو جائے پھر دیکھنا یوں چٹکیوں میں امن قائم

ہوتا ہے مگر منشی جی تم کاہے کو چاہنے لگے ہو۔ تم ٹھہرے ناکانگریسی۔''

اس آخری برجستہ فقرے پہ منشی نورالحق بہت کھٹے۔ کئی منٹ تک وہ بہت خاموشی سے حقہ پیتے رہے اور پھر انہوں نے بہت اطمینان سے حقہ کی ''نے'' ایک طرف رکھی اور کہنا شروع کیا۔

لو ہم بتاتے ہیں تقدیر امم کیا ہے؟
یعنی سیف و سناں اول طاؤس و رباب آخر

سید صاحب چکرائے کیا مطلب؟

منشی نورالحق نے حکیمانہ انداز میں کہنا شروع کیا کہ مطلب یہ ہے کہ قوم پہلے تلوار سنبھالتی ہے پھر اسے تخت طاؤس نصیب ہوتا ہے پھر وہ گانے بجانے میں پھنس جاتی ہے اور اس طرح اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

سید صاحب گانے بجانے کے ٹکڑے کو لے اڑے اماں گانے بجانے کی تو یہ سن لو کہ اس بازار میں کونے سے لے کر اس کونے تک ہر بنئے کی دکان پہ ریڈیو چلتا ہے اور اس پہ گانا بجانا ہوتا ہے۔

اجی بنیوں پہ لعنت بھیجو منشی نورالحق کے لہجہ میں رفتہ رفتہ گرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کراچی میں سارے عیاش مسلمان جمع ہو گئے ہیں دن رات وہاں ناچ گانا ہوتا ہے اور سالا یہاں کا بھی سارا گندہ مادہ وہیں جمع ہو گیا ہے یہاں تو ہمیں تباہ کر ہی گئے اب مجھے ڈر ہے کہ پاکستان کو بھی نہ لے ڈوبیں۔

سید صاحب نے ان کے اس بیان پہ ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اماں باولے ہوئے ہو منشی صاحب کراچی میں اور کراچی چھوڑ سارے پاکستان میں دن رات پریڈیں ہوتی ہیں۔ منشی نورالحق اب تھوڑے سے اور گرمائے صاحب یہی تو رونا ہے کہ وہاں دن رات پریڈیں نہیں ہوتیں بس چند لوگ ہیں جو پریڈ کرتے ہیں باقی سب مٹر گشتیاں کرتے ہیں۔

یہاں میں نے ایک ٹکڑا لگایا صاحب سب لوگ پریڈ کر بھی نہیں سکتے آپ کارخانوں کے مزدوروں اور کھیتوں کے کسانوں سے یہ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنا کام چھوڑ کے نیشنل گارڈز میں بھرتی ہوں گے۔

منشی نورالحق اس بات پہ بہت برہم ہوئے اور بولے کہ صاحب کیسے کارخانے کیسے کھیت لڑائی کے لئے ہر ایک کو کمر بستہ رہنا چاہئے۔ ادھر بگل بجا اور ادھر سب لوگ مزدور' کسان' دکاندار' افسر سب دن سے میدان میں۔

مجھے رفتہ رفتہ یہ محسوس ہوا کہ اب منشی نورالحق کی بھی نیت بگڑ چلی ہے اور وہ تقریر پہ مائل ہیں۔ میں ہمت کر کے اٹھ ہی تو کھڑا ہوا

سید صاحب نے لاکھ روکا لیکن میں بھی پتہ توڑ کے ایسا بھاگا کہ پیچھے مڑ کے نہ دیکھا۔

خلیفہ جی یہ ڈھر تو خوب آباد ہوا ستار والے کا اشارہ در حقیقت سید آل حسن کی حویلی کی طرف تھا۔ خلیفہ جی اس کی بات ایسے پی گئے گویا انہوں نے سنا ہی نہیں ہے۔

خلیفہ جی کو اب بولنا ہی پڑا ابے یار چپکا بھی رہ۔ یہ گھر تو برباد ہو گیا اب کیا آباد ہوگا اور پھر انہوں نے اپنی بات کی مجھ سے داد چاہی کیوں بھائی انتظار میں نے سچ کہا نا میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خلیفہ جی واقعی سچ کہتے تھے۔ گھر اور محلے اور بستیاں اور قریے خالی خولی انسانی جانوں سے تو آباد نہیں ہوتے وہ تو ایک فضا ہوتی ہے جو ان میں زندگی پیدا کرتی ہے اس حویلی کے اس بڑے ہال میں جہاں فرش فرش اور قالین بچھے رہتے تھے اور جہاں ہاپوڑ میونسپلٹی کی چیئرمین کے جوڑ توڑ کے علاوہ مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے۔ اب وہاں شرنارتھیوں کے بستر بچھے ہیں۔ حویلی کی دیواروں پر کا ہی تو پہلے ہی جمنی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اب ان سے لونی بھی جھڑنے لگی ہے۔ حویلی سے پرے وہ دوسرا پھاٹک والا مکان ہے اس میں بھی اگرچہ شرنارتھی آباد ہیں۔ لیکن اس کی خراب و خستہ منڈیر پر بالعموم ایک چیل اونگھتی نظر آتی ہے جانے والے اس گلی کی رونق اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ نٹ کھٹ آوارہ لڑکے جو یہاں دن بھر خاک اڑاتے تھے جانے اب کون سے جنگل کی خاک پھانکتے ہیں نیم کے سایوں اور سائبانوں کے نیچے اب وہ چارپائیاں نظر نہیں آتیں۔ جن پر چوبیس گھنٹے بے فکرے مجمع جمع کیے بیٹھے رہتے تھے۔ ان بے فکروں کو کون سی فکر کہاں لے گئی' یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ البتہ اب یہاں دن میں راہگیروں پہ فقرے بازیاں نہیں ہوتیں اور رات کو جان عالم اور شاہ بہرام کے قصے نہیں ہوتے۔ اب اس گلی میں گزرنے والے خود اپنے قدموں کی چاپ پہ چونکتے ہیں ہر شخص یا تو مصروف نظر آتا ہے یا سہما سہما۔ خوف اب تصور کی اوپری سطح سے گزر کر طبیعتوں میں رچ گیا ہے اس گلی کی فضا میں دو نئے عناصر کا اضافہ ہوا ہے خوف کی ایک مبہم کیفیت اور ویرانی کا ایک واضح احساس صبح ہوئی اور لوگ غم روزگار میں گھروں سے نکل گئے پھر گلی سنسان ہو جاتی ہے۔ پہاڑ سا دن گزر جاتا ہے اور سکوت و اضمحلال کی کیفیت کم ہونے میں نہیں آتی۔ جھٹپٹے کے وقت ساری گلی قدموں کی چاپ سے گونج اٹھتی ہے۔ لیکن ان قدموں کی چاپ سے ویرانی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے قدم عجلت سے گھروں کی طرف اٹھتے ہیں اور پھر گھروں کے دروازے آہستہ آہستہ بند ہونے لگتے ہیں اور پھر شام سے محلہ میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ ساری گلی میں ہو حق کرتی ہے۔ مینہ بوندی ہو یا آسمان پہ تاروں کی کوڑیاں بکھری ہوئی ہوں' چاندنی کھلی ہوئی ہو یا اندھیری رات ہو اس گلی پہ وہی ایک کیفیت طاری رہتی ہے۔ میر صاحب کے چبوترے پہ جانے کب سے جھاڑو نہیں پھری جس حقے کی گڑگڑ آدھی رات تک محلے میں جاگ باگ رکھتی تھی۔ اب نہ وہ حقہ باقی ہے اور نہ اس حقے کے پینے

والے نظر آتے ہیں کبھی کبھی کوئی ستم رسیدہ کتا حلوائیوں کی دکانوں پہ منڈلاتے ہوئے کتوں کے طرز عمل سے بددل ہو کر اس گلی کا رخ کرتا ہے اور زندگی کے اس الٹے کارخانے سے بیزار ہو کر کانپتا چبوترے پہ آن لیٹتا ہے۔ اس چبوترے سے دو قدم پرے جو دکان ہے وہ بند تو نہیں ہے لیکن کھلی ہوئی سی بھی نظر نہیں آتی جس چارپائی اور تپائی پہ بیٹھ کے میر صاحب اور ان کے حوار نگین چھبیل چھبیل دھونیوں کے گھونگھٹوں سے لے کے سفید ڈاڑھیوں تک ہر چیز پہ برجستگی اور بے تکلفی سے اظہار رائے کرتے تھے وہ اب یہاں سے ندارد ہیں۔ ان کے بغیر یہ دکان کچھ کچھ ننگی نظر آتی ہے اور پھر اس کے کواڑ اب مستقل طور پر کچھ اس انداز ے بھڑے رہتے ہیں گویا خود وہ اپنے ماضی کا سوگ کر رہی ہے۔

استاد کا دم غنیمت ہے ان کے چبوترے پہ اب بھی اسی انداز سے چوکی چارپائی اور مونڈھے بچھے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چوکی کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے ہیں اور مونڈھیوں کی تیلیوں کا ظہر ترتیب بگڑتا چلا جا رہا ہے زندگی کے ہنگاموں سے اکتا کر استاد پہلے ہی خاموش ہو چکے تھے اب وہ کچھ اور زیادہ چپ چپ رہنے لگے ہیں ان کے جو تھوڑے بہت پٹھے بچ رہے تھے۔ اب وہ بھی تتر بتر ہو گئے محض بات کو چلانے کی خاطر میں نے کہا تھا استاد وہ آپ کا رمضانی لاہور میں استاد یکا یک چونکے ہاں ہاں حرامزدہ سور کا بچہ الو کا پٹھا رمضانی یاں سے بھاگ گیا اجی اس نے ہمیشہ مفت کی روٹیاں توڑیں۔ اس کے بس کا کام کاج نہیں ہے اور یہ کہہ کر پھر وہ اپنے اسی پرانے انداز میں گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھ کے اونگھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر چونکے اور مجھ سے بولے میاں تمہارے پاکستان میں کچھ دم درود بھی ہے۔

میرے جواب پر انہوں نے آہستہ سے ہوں کیا اور پھر چپ ہو رہے۔

میں نے بات کی چلانے کی خاطر پھر انہیں مخاطب کیا صاحب ہاپوڑ سے کچھ زیادہ لوگ تو غالباً نہیں گئے ہیں۔

استاد اس فقرے پہ کچھ عجیب انداز سے چونکے میاں یاں اب کوئی نہیں ہے سب چلے گئے یاں سے سب گئے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگے سب چلے گئے اور میں سوچتا ہوں کہ اس سال محرم کی مجلسیں اس گھر میں کیسے ہوں گی۔

ہاپوڑ سونا سونا ہے۔ لیکن دلی ابتری اور افراتفری کا شکار ہے۔ رونق اگر ہنگامے پہ موقوف ہوتی ہے تو ہنگام تو دلی میں بہت ہے اور ہر طرح کا ہنگامہ۔ چاندنی چوک کا ہنگامہ اب دوگنا چوگنا ہو گیا ہے گھنٹہ گھر نئی سڑک چاندنی چوک جدھر جائیے ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ ان بازاروں میں ہر رنگ ہر قماش کا آدمی نظر آتا ہے۔ دلی کی مانوس راہگزاروں پہ نامانوس صورتوں کا ہجوم ہے مانوس صورتوں کا کال ہے۔ لیکن سنگ و خشت کے جہان کی مانوسیت باقی ہے۔ لال قلعہ کی اجلی اجلی فصیلوں کو دیکھ کر اب بھی یہی گمان گزرتا ہے کہ وہ ابھی

ابھی بن کے تیار ہوا ہے۔ اس کی پیشانی سے یونین جیک کا نشان مٹ چکا ہے۔ اب وہاں ترنگا لہراتا ہے جامع مسجد کی دیواریں اور مینار صحیح وسالم کھڑے ہیں۔ بس ایک عقب کی دیوار پہ آتشزدگی سے ایک داغ پڑ گیا ہے۔ یہ داغ اب کیا مٹے گا۔ دیوار کی اس سمت پر آگے میرٹھ والے کبابی کی دکان تھی۔ دکان کے آثار مٹ چکے ہیں اس تکونے ٹکڑے پہ اب ایک چمار جوتیاں گانٹھتا نظر آتا ہے۔

میں دلی کے اینٹ پتھروں کو دیکھنے پہ مائل تھا اور سرہر مرتبہ چونکتی تھی ارے آپ نے جامع مسجد بھی نہیں دیکھی آپ نے لال قلعہ بھی نہیں دیکھا؟ آپ قطب مینار بھی نہیں گئے؟

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ قطب صاحب کی لاٹھ سے لے کے جمنا جی کے پاٹ تک میں نے بہت سی چیزیں دیکھی تھیں لیکن انہیں ان سالوں کب دیکھا تھا قطب مینار پہ عجب عالم تھا۔ برسات نے اس کے اطراف کو کچھ اس انداز سے بنایا سنوارا تھا کہ مشاطہ قدرت کا ہاتھ چومنے کو جی چاہتا تھا اور موسم بھی کبھی کا ہے کو ایسا ہوا ہوگا آسمان پہ اودی اودی کالی کالی بدلیوں کی وہ ریل پیل تھی کہ ایک پہ ایک گرتی تھی۔ بدلیوں کا ہر قافلہ کچھ اس گھبراہٹ سے دوڑتا چلتا تھا۔ گویا قطب کی دسترس سے بچ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ تھم تھم کر بوندا باندی ہوتی تھی۔ پھر بڑی بڑی بوندیں ٹپ ٹپ روشوں پہ گرتی تھیں اور پھر ایکا ایکی موسلا دھار بارش ہونے لگتی تھی۔ پھر ایک دم سے بارش رک جاتی تھی اور ننھی ننھی پھوار پڑنے لگتی تھی۔ غرض قدرت نے تو اپنی طرف سے ستم ڈھانے میں کسر چھوڑی نہیں تھی اب اگر کوئی قدردان ہی نہ ہو تو اس میں اس کی کیا خطا ہے بےفکروں اور یار باشوں کی وہ ٹولیاں جو موسم سے اک ذرا شہ ملنے پہ ہار مونیم گلے میں ڈال' ناشتے دان ہاتھ میں لٹکا قطب پہ جا دھمکتی تھیں کہیں نظر نہ آئیں جو لوگ قطب دیکھنے آئے تھے وہ سر سے فرض کا بوجھ اتار رہے تھے شبنمی پھوار سے بچتے بچاتے لوگ مینار پہ پہنچتے تھے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس کی چوٹی پہ جاتے اور پھر عجلت سے نیچے اترتے اور تانگوں' اکوں اور بسوں میں بیٹھ یہ جا وہ جا۔ ہم دو تھے اس لئے مینار پر نہ چڑھ سکے۔

اب مینار پر چڑھنے کے لئے تین کی شرط ہے قطب صاحب کا یہ نیا مصرف نکلا ہے کہ ناکام نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اس پہ سے کود کے خودکشی کرتے ہیں۔ یہیں ہمیں وہ صاحبزادے ملے تھے جو سمجھا رہے تھے کہ کیوے ہیں کہ یو مینار قطب الدین کا بنوایا ہوا ہے مگر یو بھی سنے ہیں کہ پرتھوی راج نے وسے بنوایا تھا۔

میں بولا "مگر یار اس پہ یہ قرآن کے شبد کس خوشی میں لکھے ہوئے ہیں۔"

سنگھ کی رگ ظرافت پھڑکی منہ بنا کے بولا اگر آپ غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ یہ حروف بعد میں نقش کئے گئے ہیں۔

اس فقرے پر لڑکا ایسا بدکا کہ پھر اس نے پھٹے پہ ہاتھ ہی نہ رکھنے دیا میں نے اسے لاکھ پچکارا لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر کب واپس

آتا ہے گھوڑا ہو یا لونڈا بس بد کا سو بد کا۔

وہ جمعرات کی شام تھی جب میں اور میرے ساتھ ریوتی اور سنگھ غالب کے مزار سے ہوتے ہوئے خواجہ حضرت نظام الدین کی درگاہ پہنچے در حقیقت یہ سارا علاقہ کچھ مزاروں کا علاقہ نظر آتا ہے ہر طرف شکستہ مزار ہیں خستہ حال مقبرے ہیں ویران گنبد ہیں جس طرف نگاہ اٹھایئے کوئی شکستہ حال کائی آلو گنبد دکھائی دیتا ہے اور اس پہ گدھوں کے سیاہ مل گجے سائے آہستہ آہستہ رینگتے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آس پاس کے علاقوں کے سارے گدھ سمٹ کر ان گنبدوں پہ جمع ہو گئے ہیں اور یہاں سے سرکنے کی انہوں نے قسم کھا رکھی ہے۔ مرزا غالب غرق دریا نہ ہو سکے۔ ان کی قسمت میں رسوائی لکھی تھی۔ ان کا جنازہ بھی اٹھا مزار بھی بنا اور اب اس پہ ویرانی برستی ہے شکستہ حال مقبروں کے اس علاقے میں جہاں اور بہت سے مزار ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں وہاں ایک چہار دیواری کے اندر یہ مزار بھی اپنی ویرانی کا سوگوار ہے سر سے اونچی گھاس میں کود پھاند کر مزار تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ عین دروازے کے سامنے اتنی لمبی اور گھنی گھاس کو دیکھ کر میرا دل اندر سے پوچھنے لگا کہ کیا مرزا نوشہ اب جمعرات کے چراغ اور کبھی کبھار کی فاتحہ کے بھی حقدار نہ رہے

غالب کے مزار سے چلے تو حضرت نظام الدین کی درگاہ پہنچے عجب اداس اداس فضا تھی۔ اکا دکا برقعہ پوش عورتیں' بعض نقابیں اٹھی ہوئی بعض نقابیں گری ہوئی چند ایک معتقدین' لوگ خاموشی سے اندر جاتے تھے اور پھولوں سے لدے پھندے مزار پر فاتحہ پڑھتے تھے' دعائیں مانگتے تھے چڑھاوے چڑھاتے تھے اور نکل آتے تھے۔ اسی عالم میں تین آدمیوں کی ایک ٹولی ہارمونیم لئے نمودار ہوئی۔ بیچ صحن میں بیٹھ کے انہوں نے ہارمونیم کو درست کیا اور لہک لہک کے گانا شروع کیا۔

اے جی شبیر مدینہ چھوڑ چلے
ہاں جی شبیر مدینہ چھوڑ چلے

اس سے آگے چلے تو حضرت امیر خسرو کا مزار دیکھا مزار پر ایک دوہا بھی لکھا تھا۔

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارو کیس
چل خسرو گھر آ اپنے سانجھ بھئی چوندیس

دوہے کی وجہ نزول بھی لکھی تھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو نے دلی میں آ کے اپنے مرشد حضرت نظام الدین کی وفات کی خبر سنی تو انہوں نے یہ دوہا کہا اور بے ہوش ہو گئے اور ایسے بے ہوش ہوئے کہ پھر ہوش میں نہ آئے۔

واپسی کی نیت سے ہم وہاں سے پلٹے صحن میں قوالوں کی چوکڑی اب تک جمی ہوئی تھی اور وہی مصرعہ دہرایا جا رہا تھا۔

گھر گھر میں اداسی چھائی ہے شبیر مدینہ چھوڑ چلے
ہاں گھر گھر میں اداسی چھائی ہے
اے گھر گھر میں اداسی چھائی ہے

قوالوں کی آواز بہت دور تک تعاقب کرتی رہی اور رفتہ رفتہ بالکل زائل ہوگئی ہم لوگ درگاہ سے باہر نکل آئے تھے رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے سڑک خاموش تھی کبھی کبھار تاریکی میں کھوئے ہوئے کسی باغ سے کسی بھٹکے ہوئے مور کی میاؤں کی آواز آجاتی تھی بہت دور تک ہم خاموش پیدل چلتے رہے پھر سائیکلوں پہ سوار ہوئے لیکن امیر خسرو کا دوہا رہ رہ کے یاد آتا رہا۔

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارو کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چوندیس

جنم اشٹمی دلی میں ہوئی برلا مندر کی رونق کے کیا کہنے۔ ہر طرف دھوم دھام' خلق خدا کا اژدہام اوپر سے تھالی پھینکتے تو سروں پہ تیرتی چلی جائے رنگوں کی ریل پیل دھکم دھکا کھوئے سے کھوا چھلتا تھا۔ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ اندر پہنچے تو اور مصیبت آتی تنگ گیلریوں سے گزرنا دشوار ہوگیا۔ چار قدم بڑھتے تھے تو آٹھ قدم ہٹتے تھے۔ ذرا پیچھے مڑ کر ساتھی کو دیکھا تو ساتھی آگے اور خود پیچھے کھسکتے نظر آئے ریوتی کو اس عمارت کا تصور بہت پسند تھا اور سنگھ بار بار حیران ہو کے پوچھتا تھا کہ اس مندر کی مورتیاں کیسی ہیں چہرے سپاٹ معنویت ندارد' پراسراریت غائب میں نے اسے سمجھایا کہ یہ برلا مندر ہے اس میں گجریاں ہی ہو سکتی تھیں مورتیوں کو یہاں تلاش مت کرو۔ اور میرا اب بھی یہی خیال ہے برلا مندر بہرحال آج کل کے صنعتی دور کی عمارت ہے اس میں برلائیت زیادہ ہے مندریت کمیاب ہے بلکہ نایاب ہے۔

دلی سے چلتے وقت بہت دل دکھا لیکن کیا بھی کیا جا سکتا تھا بندگی بیچارگی کا معاملہ تھا۔ وہاں لاریوں کا سارے دن تانتا بندھا رہتا تھا۔ جمنا سے دوڑ لگاتی ہیں اور گنگا کا کنارہ جا چھوتی ہیں میں بھی ایک لاری میں جا بیٹھا کلینر بار بار صدا لگاتا تھا چلو گڑھ ہاپوڑ کو۔ گڑھ کی گاڑی چھوٹ گئی۔ گڑھ والو آجاؤ لیکن نہ اپیلیں کام آئیں اور نہ دھمکیاں جو تین چار مسافر مارے پھنکارے آبیٹھے تھے۔ ان میں ایک کا بھی تو اضافہ نہ ہوا بال آخر لاری اپنی جگہ سے سرکی لیکن کیا سرکی جمنا کے پل کے کنارے پہ پہنچ کے پھر کھڑی ہوگئی۔ سورج

آہستہ آہستہ پھر رہا تھا اس کی کرنوں کے لمس سے بے خبر جمنا کی تھکی ماندی لہریں اسی یکسانیت کے ساتھ بہے چلی جا رہی تھیں اور جب پل سے لاری گزرنے لگی تو مجھے یکا یک خیال آیا کہ یہ لاری کے مسافر جمنا مائی کی جے کے نعرے کیوں نہیں لگاتے اور پیسے دھیلے اور اکنیاں پھینکنے کی آواز کیوں نہیں آتی۔ گنتی کے تین چار مسافر کوئی اونگھتا تھا کوئی بت بنا بیٹھا تھا اور کسی کو سرت نہ تھی کہ اس کے قدموں کے نیچے جمنا بہہ رہی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ یہ لوگ بے حس ہو گئے ہیں تو میں ہی اس رسم کو زندہ کروں اور جمنا کو ہندوستانی سکے تو بہت نذر ہوئے ہیں ایک پاکستانی سکہ بھی اس کی نذر سہی لیکن جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو دیکھا میدان صاف ہے۔ دراصل میرے بھانجوں نے تبرک سمجھ کر ساری پاکستانی خریج جیب سے پار کر دی تھی۔ ہاں مجھ سے چوک ہوئی لیکن یہ لاری کو کیا ہوا تھا لشم پشتم شاہدرے پہنچی وہاں پھر جم گئی اور پھر کلینر صاحب نے اپنے فرسودہ نعرے بڑے جوش و خروش سے دہرانے شروع کر دیئے خیر یہاں ان کے لہجہ کی گرمی کام کر گئی۔ ایک چھوڑ کئی مسافر آئے اور سوار ہو گئے لیکن لاری کو نہ بھرنا تھا اور نہ بھری۔ لاری پھر روانہ ہوئی اور پھر ذرا رفتار تیز ہوئی تو دل کو ڈھارس ہوئی کہ گھر جلدی پہنچ جائیں گے۔ دوسرے مسافروں میں بھی اب تھوڑی سی گرمائی آ چلی تھی۔ مجھ سے پچھلی سیٹ پہ ایک بڑھیا اپنی برابر والی سے درخواست کر رہی تھی لالی جرو پلنگ کو ہو جا۔

تھوڑی سی نقل و حرکت کے بعد وہ پھر بولی اری یاں سو تو کاں جاری اے۔

پلکھوئے کو

پلکھوے میں تیرا پیہر ہے

میاواں مورا مرد ہے

کیا کرت ہے؟

پنسارے کی دکان۔

اور جب وہ بڑھیا سارے سوال کر چکی تو پلکھوے والے کی عورت نے اس سے خطاب کیا۔ میا تو کاں سو آری اے۔

اس سوال پہ بڑھیا کا دل بھر آیا۔ اری کیا بتاؤں مورا اللا دلی میں بوپارے کرے ہے۔ نگر وا کی دکان میں تالو پڑو تھا۔ ڈہم ڈھیرے مار کے چلی آئی۔

ہائے ری کل تو اتوار تھی۔ دکان پہ کاں سو ملتا۔ کسی اڑوسی پڑوسی سو اس کو پتو پوچھ لیتی۔

بڑھیا کے لہجہ میں رقت پیدا ہو گئی۔ اری میا پرانو آدمی تو کوئی ملا ہی نئیں اب تو سب نیو نیو ہیں۔ سبو سبو پونچھا۔ سبو نے کہہ دیا

ہمیں کا ہو کو پتو نا ہیں۔

اس سے پچھلی نشست پہ ایک بہت گرم بحث چھڑ گئی تھی۔ ایک لالہ کہہ رہے تھے میں نے وا سے بہتیرا کیا کہ بابو یہ تیری دھرم پتی ہے۔ دھرم کے نام پہ ہندوستانی کے سنگھٹن کے نام پہ میں تجھ سے پراتھنا کروں ہوں کہ تو وا کو گھر لے جا۔ پر اس ناستک نے ایک ناہیں سنی۔

ایک دوسرے لالہ بولے بڑا اپنائے ہے۔

ایک نوجوان نے کہنا شروع کیا پرنتو دھرم کا پالن یہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا ایک پنڈت جی نے بیچ میں بات کاٹ دی بچہ دھرم کی بات مت کر ہندو جاتی میں اب دھرم کہاں ہے۔

یدی ماہراج دھرم نشٹ ہو گیا تو یہ تو او بک گھٹنا ہو گی پرمیشور کی کیا لیلا ہے۔

پنڈت جی نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کی بڑی لیلا ہے مایا چھایا ہے شریر نشٹ ہو جاتا ہے آتما امر ہے۔

وہ نوجوان بولا پرنتو پچھم کی جن جاتیوں نے انتی کی ہے وہ جیون کا اتم اویش مایا کو ہی سمجھتی ہیں۔ اس پر کا وہ آتما کو نہیں مانتیں۔

اس پہ ایک صاحب بہت بگڑے‘ کہنے لگے کہ بابو پچھمی جاتیوں کی سبھتا میں تو دھرم کا استھان ہے ہی نہیں۔ ان کی بات چھوڑ و تو ہمارے شاستر یہ کیوے ہیں کہ آتمک سمبندھ اتم سمبندھ ہے۔

پنڈت جی نے پھر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ منش جاتی میں بھن بھن پرکار کے سمبندھ ہیں۔ دھارمک‘ جاتک‘ سماجک‘ شارا ریک‘ آتمک‘ سارے سمبندھ نشٹ ہو جائیں گے۔ آتما کا سمبندھ امر ہے۔ یہ دلی کی راجدھانی ایک مرگھٹ سمان ہے۔ یاں ہر اور مہا پرشوں‘ تھا مہاراجاؤں کی سمادھیاں ہیں کیسے کیسے بلوان اور شکتی مان اس نگر میں آئے تھا جو مہاراجہ آیا اس نے یدھ استھاپت کی‘ جنتا پہ اتیاچار کئے‘ پرشوں کی اپتا کی‘ استریوں کا اپمان کیا۔ دل کی دھرتی لال ہو گئی‘ وایو منڈل کانپ گیا‘ پرنتو اب وہ نہ مہاراجے ہیں نہ ان کا راج پاٹ ہے نہ ان کی سینائیں ہیں مایا چھایا ہے‘ شریر نشٹ ہو جائے گا اتیاچاری کا ناش ہو گا آتما امر ہے۔

مسافروں کے چہروں پر اس آمیز سنجیدگی پیدا ہو چلی تھی۔ ہر شخص کسی عجیب سی کیفیت میں گم تھا پلکا صوے والے کی عورت اور دلی کے بیوپاری کی ماتا بھی چپ تھیں میں نے لاری کے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ لاری کی رفتار خاصی تیز تھی۔ لیکن اس کی آواز میں ایک افسردی آمیز یکسانیت پیدا ہو گئی تھی چند اونگھتی رینگتی بھینسیں سر نیوڑھائے چلتی نظر آئیں اور پھر رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ سڑک سے چند قدم ہٹ کر جا بجا آم کے درخت چپ چاپ سر نیوڑھائے یوں کھڑے تھے گویا ابھی کوئی بھاری دولت لٹا

چکے ہیں اور اب اپنی ناداری پہ متاسف ہیں میں نے سر اندر کر لیا پنڈت جی کی تقریر ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی اور اب وہ بہت اطمینان سے اپنے برابر والے ساتھی کے کاندھے پہ سر لگائے سو رہے تھے۔ جن لالہ جی نے ناستک پتی کا قصہ سنایا تھا۔ ان کی آنکھ بار بار لگ جاتی تھی لیکن لاری کے جھٹکے سے چونک کر وہ بار بار آنکھیں کھول دیتے تھے۔ میرے برابر لاری کے مالک سردار جی گم سم بیٹھے سامنے سڑک کو تک رہے تھے اور پھر رفتہ رفتہ میں بھی اونگھنے لگا۔

اب میرے قیام کی معیاد ایک دن رہ گئی تھی۔ سفر سر پہ سوار تھا۔ مفارقت کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ سوچا کہ اور کچھ نہ سہی۔ میرٹھ کا ایک چکر کاٹ ہی آئیں۔ بھاگم بھاگ میرٹھ پہنچا میرٹھ کا لاری کا اڈہ ہاپوڑ کے سٹیشن سے بھی چار جوتے بڑھا ہوا تھا یاں ہر طرف رکشائیں ہی رکشائیں تھیں اور تانگہ ندارد تھا بہت آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو سڑک کے دوسرے کنارے پہ سب سے الگ ایک خستہ حال تانگہ نظر آیا تانگہ والے نے دور سے صدا لگائی۔ میاں تانگے میں بیٹھنا ہو تو آ جاؤ گھنٹہ گھر چل ریا اوں۔ میں کچھ کہے سنے بغیر چپ چاپ تانگے میں جا بیٹھا۔ تانگہ چار قدم بڑھا ہو گا کہ ایک رکشہ والے کو آگے جاتے دیکھ کر تانگے والے نے ڈانٹ بتائی اب او چوئی کے۔ کیا بیچ سڑک پہ مکھیں مار ریا اے۔ ایک طرف کو ہٹ۔

اور پھر وہ میری طرف دیکھ کے ہنسا میاں مجھ سے یہ رشکا والے بہت کلسیں ہیں میں دن سالوں کو دھتکار دوں ہوں۔

ایک گنوار کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کے وہ کچھ ٹھٹھکا مقدم گھنٹہ گھر چل رے او

کھا لیوے گا

تو کیا بتاوے گا۔

اکنی۔

اس پہ تانگے والا بہت برہم ہوا مقدم پیچھے رشکا آ رہی اے وکمیں بیٹھ جاتی دیر میں اپنا تانگہ ایک اور رکشا کے قریب جا پہنچا تھا۔ وہ پھر بگڑا ابے یار یہ اٹھک بیٹھک ایک طرف ہٹ کے کرنا کیا بیچ میں کوڑا کر راے

رکشا والے نے بہت گھور کے اسے دیکھا۔ لیکن تانگے والا اس سے قطعاً بے اعتنا ہو کے اپنے گھوڑے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

خیر نگر کے رنگ ڈھنگ اب اور ہیں گھنٹہ گھر کا نقشہ بدلا ہوا ہے لیکن شبیر کی چائے اور پان بیڑی کی مشترکہ دکان اسی انداز سے قائم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے پرانے گاہک اب وہاں منڈلاتے نظر نہیں آتے لیکن اس شبیر کی کیا خطا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ میرٹھ کے سارے کوچہ گردوں، لپاٹیوں، سنکیوں اور خطیبوں کا ٹھکانہ یہی دکان تھی۔ یاں بیٹھ کے شعر لکھے جاتے جاتے تھے میرٹھ کالج

میگزین کے لئے مضمون جمع ہوتے تھے قواعد اور زبان پہ بحثیں ہوتی تھیں اور نکٹی نی کے سینے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ درویش میرٹھی خدا انہیں جنت نصیب کرے عجب آدمی تھے۔ شعر کے رسیا' قواعد کے دھنی' جو لفظ ہتھے چڑھ گیا اس کا کچومر نکال کے چھوڑا شام کو اکثر گھنٹہ گھر پہ شکار کی تلاش میں ٹہلتے ہوئے پائے جاتے تھے کوئی شریف آدمی ادھر سے گزرا اور انہوں نے لپکا سیدھے شبیر کی دکان پہ پہنچے چائے طلب کی اور بحث کا آغاز کر دیا۔ صاحب یہ لفظ دراصل فضا نہیں ہے۔ فضا ہے غیاث اللغات میں اس کا تلفظ یہی لکھا ہے۔ اب ان کی مخالفت کیجئے تو آفت موافقت کیجئے تو آفت۔ مخالفت کرنے والوں کی شامت تو خیر آتی ہی تھی لیکن تائید کرنے والوں کو بھی ہم نے سکھ پاتے نہ دیکھا۔ وہ فوراً پینترا بدل لیتے۔ صاحب آپ نے بے سوچے سمجھے میری تائید کر دی میں نے غلط کہا تھا۔ غالباً آپ نے غیاث اللغات کبھی نہیں دیکھی۔

میں نے شبیر کی دکان کے بہت چکر کاٹے کسی کا پتہ نہ ملا۔ ایک دو دوست جو میرٹھ میں رکے ہوئے ہیں۔ انہیں گھر جا کے پکڑا۔ عاصم صاحب کہتے تھے بھئی انتظار اب تو عید اس بستر پر لیٹے لیٹے گزر جاتی ہے کس کے پاس جائیں کس سے ملیں۔

میں نے کہا۔ تو پھر پاکستان آ جاؤ۔

اس پہ بہت گرم ہوئے ہرگز نہیں۔ ہندوستان سے نہیں ہلوں گا۔

عاصم صاحب کی خاکساریت اگرچہ رفو چکر ہو گئی ہے لیکن رسی کے بل باقی ہیں۔ بار بار سر کھجا کے کہتے تھے یار کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے کہا۔ یار وکالت کرتے ہو۔ مزے کرو کرنے کو اب یاں کیا رکھا ہے۔

انہوں نے سر کھجایا ہاں ہاں مگر پھر بھی کچھ کرنے کو طبیعت چاہتی ہے مگر راستے تو سارے بند ہیں۔

میں نے لیاقت نہرو معاہدے کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ ان کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ چھوڑو لیاقت نہرو معاہدے کی بات۔ تمہاری حکومت ہمیشہ گھٹیا بات سوچتی ہے۔ وہ ہمیشہ چمڑی اور دمڑی کی بات کرتی ہے اور یاں پگڑی کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔

اور شفیق صاحب کا استدلال یہ تھا کہ دیکھئے انتظار صاحب یہاں شیش محل بے انتہا مقبول ہوئی ہے ہندی میں جو پکچر بنے گی فیل ہوگی۔ گولی ماریئے دفتروں اور درسگاہوں کو۔ اردو کی اشاعت فلموں کے ذریعے ہوگی اور صاحب نسیم نے بھی اردو مکالمے اس شان سے ادا کئے ہیں کہ نرگس ورگس سب کے چونا لگا گیا۔

وہ بہت اڑنے لگے تو میں ان سے آہستہ سے پوچھ لیا مگر کب تک؟

اس سوال پہ وہ بری طرح ٹپٹائے۔ اس سوال پہ وہاں ہر شخص ٹپٹا جاتا ہے مستقبل ان کے لئے دھند میں لپٹا ہوا ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے وہ آئندہ کے متعلق کچھ نہیں سوچ سکتے کوئی بات طے نہیں کر سکتے ان سے کہئے کہ پاکستان ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں انہیں سمجھا دے کہ اب سب لوگوں کو ایک نہ ایک دن ہندوستان سے پاکستان جانا پڑے گا۔ وہ بات بھی جھٹ پٹ مان جاتے ہیں اور پھر ان سے یہ کہہ دیجئے کہ فلاں مہینے میں فلاں تہوار پہ یہاں سارے مسلمانوں کا تیا پانچا ہو جائے گا' وہ اس پہ بھی بغیر کسی چیں چپڑ کے ایمان لے آتے ہیں لیکن تسکین انہیں یوں بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ووں بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ پھر اسی ادھیڑ بن میں گھر جاتے کہ وہ کدھر جارہے ہیں اور جب وہ خود کچھ نہیں سمجھ سکتے تو پھر پاکستان سے آنے والے عزیزوں' رشتہ داروں اور میل ملاقاتیوں سے پوچھتے ہیں کہ "صاحب ہمارا کیا بنے گا۔" ہاپوڑ میں ایک صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ جناب کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں زور یا بدیر ہندوستان سے نکلنا پڑے گا۔ میں اس بات کو کیا سمجھ سکتا تھا۔ اور کیا اس کا جواب دے سکتا تھا۔

اچھن میاں ہاپوڑ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اب انہوں نے صدارت سے توبہ کر لی ہے۔ ماسٹر صاحب کی بیٹھک میں ان سے مڈ بھیڑ ہوگئی مجھے دیکھتے ہی بکھر پڑے اب پاکستان میں جا کے اپنے بھیاؤں سے کہیو کہ کل تمام یاں ہاپوڑ کی گلیوں میں ووٹ مانگتے پھرتے تھے اب بلیک لسٹ نام لکھا کے خود تو دو گیارہ ہو گئے اور اب کہتے ہو پاکستان میں جگہ نہیں ہے۔

وہ اپنی تقریر جانے کب تک جاری رکھتے۔ لیکن یار لوگوں کو ان کی تبرا بازی پسند نہ آئی۔ انہوں نے انہیں کھانے کے شغل میں لگا دیا۔ اچھن میاں کو کچھ کھانے کو دے دو پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب ہجرت کی فکر میں مبتلا تھے میں نے کہا کہ ماسٹر صاحب پاکستان جا کر کیا کیجئے گا سفر میں زحمت ہی زحمت ہے۔

میرے فقرے پہ وہ بہت خاموشی سے اٹھے اور سوچتے ہوئے زنان خانے میں چلے گئے تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہاتھ سے بہت سی کتابیں سینے سے لگائے اور دوسرے ہاتھ میں اپنے بچے کا ہاتھ پکڑے چلے آرہے ہیں میرے پاس پہنچ کر انہوں نے کتابیں میز پر پٹخ دیں اور بچے کو میرے سامنے کھڑا کر دیا کہ صاحب میری تو کچھ گزر گئی کچھ گزر جائے گی لیکن یہ میرا بچہ کیا کرے گا؟ میں نے کتابوں پہ ایک نظر ڈالی یہ ان کے بچے کے کورس کی کتابیں تھیں جو ایک دم سے سب ہندی میں تھیں اور ماسٹر صاحب کو یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ ان کا بچہ اردو نہ پڑھے گا تو تمیز کیسے سیکھے گا۔

بالآخر ہاپوڑ چھوڑنا پڑا۔ لاری سے میرٹھ آیا۔ دس ساڑھے دس بجے رات تک شبیر کی کان پہ بیٹھا رہا۔ عاصم صاحب اور شفیق صاحب سے ادب سے لے کر فلموں تک تمام موضوعات پہ باتیں کیں۔ گیارہ بجے فرنٹیئر پہ سوار ہوا۔ سوار ہوتے ہی ایک شرنارتھی سے

پالا پڑا چھوٹتے ہی اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو جی۔

میں نے گول مول سا جواب دیا۔ بہت دور۔

آخر کہاں؟

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا لاہور۔

لاہور کا نام سن کر وہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ پھر بولا تھے تو یہیں کے رہنے والے؟

میں نے جواب دیا۔ ہاں ہوں تو یہیں کا رہنے والا۔

واں کیا کرتے ہو جی؟

اخبار میں کام کرتا ہوں۔

کنڑا اخبار

امروز اخبار

اسے کون نکالتا ہے جی؟

میاں افتخار الدین

میاں افتخار الدین ارے وہ تو میرا یار ہوا تا۔ وہ بھی باغبانپورہ کا رہنے والا میں بھی باغبانپورے کا رہنے والا۔ یاد رہے تو اس سے میرا اسلام کہہ دیجو۔

اور پھر یہ کہہ کے اس نے بے ساختگی سے اونگھنا شروع کر دیا۔

سامنے کی سیٹ پہ ایک شرنارتھی۔ ایک یو پی کے ہندو سب انسپکٹر سے الجھ رہا تھا۔ اجی یہ یو۔ پی والے نہ کھانا جانیں' نہ انہیں بولنے کی تمیز' گوشت سے بھاگتے ہیں۔ پیاز سے ان کا دم خشک ہوتا ہے اور جہاز کو جہاج کہتے ہیں۔

لیکن داروغہ جی بہت کو دن نکلے۔ ان سے ایک جواب نہ بن پڑا اور اصل وہ تھے۔ جاٹ جب اس یکطرفہ بحث نے بہت طول پکڑا تو ہم نے آہستہ سے کہا۔ یار' ز' کی آواز یو۔ پی والے ٹھیک نہیں نکالتے اور ق کی آواز تم سے ادا نہیں ہوتی۔ معاملہ برابر رہا۔

اس پہ اس نے بے ساختہ کوے کی آواز زور سے نکالی اور برہم ہو کے کہا اجی یہ ٹھہری کوؤں کی آواز۔ ہمارے بس کی کہاں ہے۔

اور رفتہ رفتہ ساری بحثیں ختم ہو گئیں ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ داروغہ جی اپنے بستر پہ دراز ہو چکے تھے۔ میرے اوپر کی برتھ پہ

سردار جی زور زور سے خراٹے لے رہے تھے اور ان کے کیس لٹک کے میری چاند کو چھو رہے تھے قوے والے شرنارتھی نے بھی اونگھنا شروع کر دیا تھا میں سر نکال کے باہر دیکھنے لگا وہاں بھی چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی اور ساتھ میں تاریکی بھی۔ ایک گاڑی کی چھک چھک بدستور جاری تھی لیکن اتھا خاموشی کے سامنے اس اکیلے چنے کی کیا چلتی سہارنپور نکل گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میں میرٹھ سے کتنی دور نکل آیا ہوں۔ گاڑی تیزی سے دوڑتی چلی جا رہی تھی میرٹھ پیچھے کھسکتا چلا جا رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار سے خوفزدہ ہو کے میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اللہ دیئے تانگے والے کا خیال آیا جس کے سوال کا جواب دیئے بغیر میں وہاں سے چلا آیا تھا ممکن ہے یہ سوال اس کے دل میں کانٹا بن کے اب تک کھٹک رہا ہو اور ممکن ہے وہ اس سوال کو بھول چکا ہو اور پھر رفتہ رفتہ مجھے امیر خسرو کا دوہا پھر یاد آ گیا۔

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارو کیس
چل خسرو گھر آ اپنے سانجھ بھئی چوندیس

◆◆◆

استاد

سگا کی بات کا تو خیر کیا اعتبار۔ وہ تو ہمیشہ دون کی لیتا تھا۔ مگر ہمارے سب گھر والے بھی یہی کہتے ہیں کہ استاد کا زمانہ بس دیکھنے کے لائق تھا۔ سارے شہر میں ان کی دھاک تھی۔ بڑے بڑے تیس مار خانوں کا ان کے نام سے دم خشک ہو جاتا تھا اور رئیسوں کی تو انہوں نے کبھی کوئی ہستی ہی نہ سمجھی جس کسی نے ذرا کٹر ٹکڑ کی اس کے بیچ بازار میں جوتے لگوا دیے۔ سیٹھ گوری شنکر بڑا نک چڑھا بنتا تھا۔ سو اس کی بہن کا اب تک پتہ نہیں ہے۔ رئیسوں ہی پہ کیا ہے افسروں سے بھی وہ دب کے تھوڑی ہی رہتے تھے داروغہ ہر گیان سنگھ نے اور کیا کیا تھا تعزیوں کے آگے آگے گھوڑے پہ چل رہا تھا۔ بس استاد کے تن بدن میں آگ لگ گئی بڑھ کے گھوڑے کی باگ تھام لی وہ تو صوفی جی اور نمبردار بیچ میں پڑ گئے نہیں تو کیا ہو جاتا اور بیچارے داروغہ کی تو سٹی گم ہو گئی کلام مجید کی قسم گھوڑے سے فوراً اتر پڑا اور ہاتھ سے چرٹ پھینک دی مشن بھائی کہا کرتے ہیں کہ پہلے جو بھی داروغہ یہاں بدل کر آتا تھا پہلے استاد کو سلام کرتا تھا ہاں جب پوربیا داروغہ بدل کر آیا تو اس نے استاد کو آکر سلام نہیں کیا تھا۔ استاد دو تین دن تک چپ رہے مگر جب اس نے بدبو کا نام نمبر دس کے بدمعاشوں میں لکھ لیا تو پھر انہیں تاؤ آ گیا۔ تاؤ آنے کی بات ہی تھی۔ اس میں تو استاد کی پارٹی کی ہیٹی ہوتی تھی۔ بس فوراً پوربیے سے کہلا بھیجا کہ داروغہ جی جس ہوا میں ہو۔ کمبل ڈلوا دوں گا۔ پوربیا اپنا داروغہئی میں ٹیس ہوا جاتا تھا بہت فوں فاں ہوا مگر اس کی ساری داروغائی دھری رہ گئی۔ اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس سے بھی بڑا کوئی ہے۔ میاں دسواں دن ہوا ہوگا کہ وہ دورے پہ چلا۔ استاد کے پٹھے تو اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے ہی شہر سے ابھی باہر ہی نکلا تھا کہ اسے گھیر لیا۔ اس کے ساتھ جو سپاہی تھے وہ تو اڑن چھو ہو گئے رہ گیا اکیلا داروغہ بھائی کی وہ جوتا کاری کی طبیعت ہری ہو گئی پھر اسے ایک رسی سے پیڑ میں باندھ دیا اور سامنے گھاس دانہ ڈال دیا کہ اسے کھائے جا۔ بس یہ سمجھو سالا پانی مانگ گیا اور فوراً وہاں سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔

یہ باتیں ہمارے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ اس زمانے میں استاد نہ جانے کیا ہوں گے مگر اتنا تو ہم نے بھی دیکھا ہے کہ بڑی حویلی کے مردانے میں پانچ چھ پٹھے ہمیشہ پڑے رہتے تھے۔ مردانے میں پیچھے کی طرف جو ایک کوٹھڑی ہے اور جس کے چھپر کے آگے کچی پکی دیوار کھڑی کر کے ایک مختصر سا صحن بنایا گیا ہے۔ یہ استاد کی خاص بیٹھک تھی یہیں بیٹھ کر وہ اپنے پٹھوں سے مسکوٹ کرتے تھے۔ یہیں بیٹھ کر خفیہ سکیمیں بنائی جاتی تھیں اور یہیں بیٹھ کر سنگین اور دل ہلا دینے والے فیصلے ہوتے تھے اس زمانے میں یہاں کیسی گہما گہمی

رہتی تھی۔ صبح ہی صبح بادام گھٹنے شروع ہو جاتے شمی اور مسیتا اور دوسرے پٹھے اکھاڑے سے مٹی میں لتھڑے لتھڑائے آئے کوئیا پہ نہائے اور ٹھنڈائی کے کٹورے کے کٹورے چڑھا گئے۔ پتنگوں کے زمانے میں یہاں دن دن بھر مانجھا سونتا جاتا تھا۔ لگدی میں ایسی ایسی چیزیں پڑتی تھیں کہ کسی کو ان کی ہوا بھی نہ لگی ہوگی۔ یوں ہمیں وہ مانجھا دے دیتے تھے۔ لیکن لگدی کو کبھی ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ استاد پیچ بہت دھوم سے لڑاتے تھے ڈور کی چرخیاں خالی ہو جاتی تھیں پتنگ تارا بن جاتی تھیں اگر کہیں پتنگ کٹ گئی تو ڈور کھٹ سے جھٹے پہ سے توڑ دی۔ مگر ان کی پتنگ کٹتی ہی کہاں تھی۔ ہم نے وہ پیچ بھی دیکھے ہیں جن میں جالندھر اور امرتسر تک کے پتنگ باز آ گئے تھے۔ تین دن تک پیچ لڑتے رہے جالندھر والوں نے اپنے سارے مانجھے آزما لئے۔ امرتسر والے کھینچ کے پیچ میں جواب نہیں رکھتے تھے اور بھئی ان کے ہاتھ کی صفائی تو غضب کی تھی۔ لیکن استاد نے بھی وہ ہاتھ دکھائے کہ بھائی لوگ چوکڑی بھول گئے ہیں کہ تیسرے دن امرتسریوں والوں نے آ کے استاد کے ہاتھ چوم لئے۔ ایک پتنگ کے پیچوں پہ کیا ہے ہر معرکہ میں ہی استاد کی پارٹی کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ جب کبھی دنگل ہوا استاد کے پٹھوں نے کشتی جیتی۔ محرم کے تعزیوں میں ہمیشہ استاد کا اکھاڑا سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ شب برات کی لڑائی میں ہمیشہ اشتاد کی پارٹی ہی کی جیت ہوئی۔ شب برات مہینوں پہلے سے پٹاخے تیار ہونے لگتے تھے۔ اناروں اور سینکوں اور ختنگوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا پھر بھی استاد یہی کہتے رہتے تھے کہ بھئی اب کے تیاری پوری نہیں ہوئی۔ سب برات کی لڑائی میں بنے خان خلیفہ بہت زور باندھتے تھے مگر استاد کے مقابلے میں ان کی ہمیشہ ہیٹی ہوتی۔ اجی سچ پوچھو تو بنے خان نرے اناڑی تھے اپنے اناڑپن میں وہ اپنا انگوٹھا تک کھو بیٹھے۔ استاد نے گولے کچھ کم کسے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں گولہ نہ پھٹ گیا۔ بنے خان سے گولہ کسنا ہی نہ آتا تھا ہاتھ میں گولہ پھٹ گیا۔ سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا بھٹا سا اڑ گیا۔ ساتھ میں چندے بھی ہو گئے اور بھائی مقابلہ کرتے تھے استاد کا پہلی شعبان سے چودہ شعبان تک روز رات کو گولی کے میدان میں اناروں اور سینگوں سے لڑائی ہوتی تھی۔ چودھویں کی رات کو قیامت کا معرکہ پڑتا تھا مگر دیکھا ہمیشہ یہی گیا کہ صبح ہوتے ہوتے بنے خان والے اینٹوں پہ آ جاتے تھے اور بھاگتے ہی بن پڑتی تھی ایک مرتبہ تو بدلو نے ایسا ختنگا چلایا کہ بنے خان والوں کو کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہتی تھی۔ بنے خان تو دراصل چار سو بیسی کے فن کے استاد تھے۔ جعلی دستاویزیں بنانے میں تو انہیں کمال حاصل تھا۔ کسی کے دستخط ایک نظر انہیں دکھا دو۔ بس پھر تو وہ پیر کے انگوٹھے میں قلم داب کر اس کے دستخط بنا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ٹی۔ ٹی کے سر میں پھوڑا نکلا تھا کمبخت ان سے ٹکٹ مانگ بیٹھا۔ بنے خاں سے ٹکٹ اس نے کیا مانگا۔ خود اس کا ٹکٹ کٹ گیا اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا بنے خاں نے کیا کیا کہ اپنا الٹا ہاتھ تین دن تک برف میں دابے رکھا تیسرے دن ہاتھ نکالا تو تھر تھر کانپ رہا تھا اس ہاتھ سے انہوں نے ٹی ٹی کے دستخط بنا کر استعفیٰ داغ دیا۔ جب استعفے کی منظوری کی

اطلاع ٹی۔ٹی کو پہنچی تو اس نے سر پیٹ لیا۔مگر بنے خان تو اپنا کام کر چکے تھے پھر کیا ہوتا تھا۔استاد نے ایسا سفلہ پن کبھی نہیں کیا۔وہ تو جس سے لڑتے تھے ڈنکے کی چوٹ لڑتے تھے۔بنے خاں نے استاد سے بھی سفلہ پن کیا مگر منہ کی کھائی۔استاد سے جب کسی طرح وہ نہ جیت سکے تو پھر انہوں نے چالبازی شروع کی۔انہوں نے سگا پہ بھی ہاتھ رکھنا چاہا تھا اسے انہوں نے یہ پٹی دی کہ استاد جب بازار میں نکلیں تو ان کے ایک جوتی مار دے دو سو روپے دوں گا اور ایک مکان تیرے نام لکھ دوں گا۔انہیں یہ کیا خبر تھی کہ استاد کے اکھاڑے کا نکلا ہوا آدمی مرتے مر جائے استاد پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتا وہ ہاں سے تو چپکا چلا آیا اور سیدھا استاد کے پاس پہنچا۔استاد کے قدموں پہ سر رکھ کے اس نے ٹسر ٹسر رونا شروع کر دیا غصہ تو استاد کی ناک پہ دھرا رہتا تھا۔بھنا کر بولے "اے حرامزادے روتا کیوں ہے منہ سے پھوٹ کہ ہوا کیا؟۔"

سگا ہچکیاں لیتے ہوئے بولا استاد تم میرے باپ کی جگہ ہو۔جان دے دوں گا تم سے گستاخی نہیں کروں گا۔

ابے الو کے پٹھے۔سور کے بچے مرغی والے سیدھا کھڑا ہو اور بتا بات کا ہے استاد تو ایک سانس میں ہزاروں گالیاں دے ڈالتے تھے۔

سگا نے قدموں سے سر اٹھایا پیچھے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔اجی بات یو ہے کہ وہ بھتنی والا ہے بنے خاں خلیفہ سالہ مجھ سے یو کیوے ہے کہ استاد بزار میں نکلیں تو دنکے ایک جوتی مار دے دو سو روپے دوں گا اور ایک مکان تیرے نام لکھ دوں گا۔

استاد پہلے تو بہت دونکے دہاڑے لیکن پھر ذرا سوچ کر بولے کہ ابے الو کے بچے اس سے دو سو روپے تو پہلے لے لے اور دیکھ بے یہ بھی کہیو کہ میں تو جوتا ماروں گا مگر تم بھی واں پہنچو گے۔اچھی طرح پوچھ لیجیو کہ کس طرف سے آئے گا اور کس وقت آئے گا۔

مگر بنے خاں کچی گولیوں کے کھیلے ہوئے تو نہیں تھے کہ چپکے سے دو سو کی ڈھیری سرکا دیئے بڑی حجت کے بعد انہوں نے سوا سو روپے پیشگی دیئے خیر مہنگا تو یہ سودا ابھی نہیں پڑا۔عین وقت پر استاد بھی پہنچے بنے خاں بھی پہنچے اور سگا بھی پہنچا۔استاد کے اشارے کی دیر تھی سگا نے بگھی پہ چڑھ بنے خاں کے دائیں بائیں دو جوتے اڑا دیئے پھر کیا تھا سارے بازار میں شور پڑ گیا۔بنے خاں کی پارٹی کے آدمی لٹھ لے لے کہ چڑ آئے مگر بیٹے تو استاد کے آدمی بھی نہیں تھے۔بیچ بازار میں مورچہ جم گیا تھانے سے داروغہ بھاگا ہوا آیا شہر کے بڑے بڑے رئیس آ گئے اور استاد کے قدموں پہ ٹوپیاں رکھ دیں۔تب کہیں وہ چپ ہوئے ورنہ اس روز بنے خاں والوں کے بکل اڑ گئے ہوتے۔استاد جب گھر لوٹے تو سگا نے سوا سو کے سوا سو روپے استاد کے سامنے لا کے رکھ دیئے۔سگا میں یہ بات تو لاکھ روپے کی تھی۔کتنا ہی مال ہوتا اور کتنے ہی جان جوکھوں سے حاصل کیا ہوتا استاد کی اجازت کے بغیر کوڑی گھر لے کر نہیں جاتا تھا۔ایک دفعہ

ایسا ہوا کہ شب برات سر پہ آ گئی اور بارود کے لئے پیسے کم پڑ گئے۔ سگا نے کیا کیا اپنی بیوی کے جھانجن اور چوڑیاں پار کر دیں اور انہیں بیچ کھوچ کر ساری رقم استاد کے سامنے رکھ دی۔ سچی بات یہ ہے کہ استاد تو اپنے آدمیوں پہ خون پسینہ بہانے کو تیار رہتے ہی تھے مگر ان کے آدمی بھی ان پہ جان قربان کرتے تھے اور سگا نے تو ان کی بہت ہی خدمت کی ہے۔ ویسے تھا وہ بہت گپی بے پر کی اڑاتا تھا ایک بات ہے۔

پٹانے میں اسے کمال تھا اور پھر بے پیسہ کے اس کا کہنا تو یہ تھا کہ کھلانا چٹانا عورت کا ہے لونڈا تو طمانچہ سے قبضہ میں آتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے بڑے بڑے سرکش لونڈوں کو طمانچہ سے قابو میں کیا تھا اور بزاز والے میں تو ایسی رعونت تھی کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر ہی نہ دیکھتا تھا۔ ایک روز شام کو اکیلا پیارے لال کی بغیا جا رہا تھا سگا کا داؤ چل گیا۔ کنپٹی پہ دو تھپڑ رسید کئے تھے کہ اس کے آنسو نکل آئے اور لگا ہاتھ جوڑنے۔ سگا میں کمال کی بات یہ تھی کہ دبنگ بہت تھا۔ استاد نے جس کے متعلق اشارہ کر دیا اسے بھرے مجمع سے اٹھا دیا۔ بے جگرا اور پھر استاد کے اشارے پہ جان قربان کرنے والا۔ استاد اگر کہتے کہ آگ میں کود پڑ تو آگ میں کود پڑتا اگر کہتے کہ سمندر میں چھلانگ لگا دے تو سمندر میں چھلانگ لگا دیتا۔ ایک روز شفو چلا چلا باہر سے آیا اور استاد کے گھٹنے پہ سر رکھ کر بچر بچر رونا شروع کر دیا۔ آنکھیں لال پڑ گئیں اور گورے گورے گال تمتمانے لگے استاد نے اس کے آنسو پونچھے اور بڑے پیار سے پوچھا کہ ہوا کیا شفو نے گھٹنے پر سر رکھے رکھے کہا ہیڈ ماسٹر نے مجھے فیل کر دیا۔ استاد غصہ سے آگ بھبوکا ہو گئے فوراً سگا کو ڈانٹ پلائی جاتی ابے او الو کے پٹھے یاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ جا اس حرامزادے سوئر کے بچے کی خبر لے۔ سگا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چھوٹا سا ڈنڈا پاس پڑا تھا۔ اسے بغل میں دیا وہاں سے چل پڑا۔ سکول کے قریب نالہ ہے نہیں وہاں جا کھڑا ہوا تھوڑی دیر میں ہیڈ ماسٹر سکول سے فارغ ہو ادھر سے نکلا سگا نے سر پہ دو ڈنڈے رسید کئے اور پھر کولیا بھرا سے نالے میں دے پٹخا۔ مار پیچھے پکار کی ہوا کی تھوڑی دیر میں ایک مجمع ہو گیا۔ پر سگا ایسا تیر ہوا کہ کسی کو اس کی ہوا نہیں لگی۔ پولیس جاگی تو سہی مگر بہت دیر سے۔ پھر کیا ہونا تھا۔ اول تو اس کے پرکھوں کو بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ سگا ہے کہاں پھر استاد سے ٹکر تھی۔ ہار جھک مار کر بیٹھ رہی اور دو مہینے بعد سگا دندناتا ہوا بازار میں نکلا۔ ہیڈ ماسٹر نے اگلے سال ڈر کے مارے خود ہی شفو کو پاس کر دیا شفو بھی خوب تھا یہ بڑی بڑی شربتی آنکھیں کچوری سے گال۔ سرخ سفید رنگ' چھریرا بدن انگلی پہ ڈالو تو دوہرا ہو جائے' چلتا تو یوں لگتا کہ پھولوں کی ڈالی جھونکے کھا رہی ہے۔ استاد ہاتھوں میں اس کا دل رکھتے تھے۔ انٹرنس میں پانچ سال مسلسل فیل ہونے کے بعد جب وہ چھٹے سال تیسرے درجے میں پاس ہوا تو استاد نے برادری میں مٹھائی بانٹی اور مجرا کیا۔ استاد نے اس کی شادی بھی بہت دھوم سے کی تھی۔ ولیمہ میں ساتوں کھانے دیئے بارات میں ہاتھی آیا اور وہ آتش بازی چھوٹی کہ رات

دن بن گئی۔ رت جگہ ہوا مجرے میں دور دور سے طوائفیں آئیں شہر کی طوائفوں کی تو خیر کوئی بات ہی نہیں تھی وہ تو تھیں ہی استاد کی چیلی چانٹی۔ استاد کے بغیر تو ان کے یہاں کوئی کرتب ہی نہیں ہو سکتا تھا مشتری تو استاد کی ایسی قائل تھی کہ جب تک وہ نہ پہنچتے تھے مجلس میں سوز شروع نہیں کرتی تھی اور حق یہ ہے کہ اس کی سوز خوانی کے سچے قدرداں بھی استاد ہی تھے اور لوگ تو اس کی آواز اور صورت پہ جاتے تھے۔ استاد اس کے فن پر داد دیتے تھے۔ مشتری خود اپنے یہاں بھی سات تاریخ کو بہت دھوم سے مجلس کرتی تھی استاد ہی اس مجلس کو شروع کراتے تھے اور استاد ہی اس مجلس کو ختم کراتے تھے۔ جب وہ جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت سوز شروع ہوئے تھے مجلس کے ختم پر تبرک بانٹنے کا فرض بھی انہیں ہی انجام دینا پڑتا تھا تبرک میں شیرمال اور قیمہ بٹتا تھا تبرک کے بٹنے میں کیا کیا بے ایمانیاں نہیں ہوتیں اور کیا کیا ہنگامے نہیں ہوتے مگر استاد اس دبدبہ سے تبرک بانٹتے تھے کہ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی جن چنن بچے تھے اور پھر استاد کے ہٹیلے۔ انہیں تو وہ ضرور دوہرا حصہ دے دیتے تھے باقی اور کسی کے ساتھ انہوں نے کبھی رو رعایت نہیں برتی۔ خود بھی حصہ لے کر نہیں آتے تھے بعد میں مشتری خود ہی ان کے گھر ڈھیر سارے شیرمال اور دیگچی بھرا قیمہ بھیج دیا کرتی تھی۔ حویلی کی مجلسوں کا انتظام تو خیر استاد کے سوا اور کون کرتا دس دن کے لئے سارے کام پٹ ہو جاتے۔ چاندرات سے لے کر عاشور تک محرم ہوا اور استاد ہوتے ہمارے امام باڑے میں مجلس رات کو ہوتی ہے استاد مجلس میں تو خیر کہاں بیٹھتے تھے۔ ایک پیر کھڑے رہتے کبھی امام باڑے میں آکر حاضرین کی تعداد اور گیس کی روشنی کا جائزہ لے رہے ہیں کبھی تور پہ پہنچ کر نانوں کا حال احوال دیکھ رہے ہیں۔ میاں اب کیا مجلسیں ہوتی ہیں۔ مشن بھائی مجلسیں کیا کرتے ہیں لکیر کو پیٹتے ہیں۔ اس گھر کے محرم استاد کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئے۔ دیکھنا اس زمانے میں تو ایسی مجلس ہوتی تھی کہ امام باڑے سے مردانے کے باہر تک آدمی ہی آدمی ہوتا تھا مجمع ٹھساٹھس آدمی کھچا کھچ تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ دسوں دن نان قیمہ بٹتا تھا اب کوئی نان قیمہ کیا بانٹے موتیوں کے بھاؤ گیہوں بکتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ مولا کے نام پر دل کھول کے خرچ کرتے تھے۔ سال بھر جمع کرتے تھے اور محرم پر ساری جمع جتھا پانی کی طرح بہا دیتے تھے۔ مولا ای شان کے قربان وہ پھر دیتے بھی اتنا ہی تھے۔ محرم پہ لٹانے والوں کا ہم نے کبھی ہاتھ تنگ نہیں دیکھا۔ جتنا جاتا تھا اتنا ہی آتا تھا اب وہ حوصلے رہے نہ وہ آمدنیاں رہیں۔ اب تو بتاسے بانٹنے میں بھی لوگ کھسر کھسر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ حاضریاں پہلے کس شان سے ہوتی تھیں۔ آٹھ کی شب کو جس امام باڑے کی طرف نکل جاؤ دیگیں کھنک رہی ہیں۔ کہیں بریانی اور بورانی کی حاضری ہے۔ کہیں نان قورمہ چل رہا ہے کہیں نان قورمہ چل رہا ہے کہیں کباب پراٹھوں اور حلوے پر نیاز ہوئی ہے کیا امیر کیا غریب جو آیا ہے پیٹ بھر کے کھا رہا ہے۔ بازار میں نکلو تو امام تشنہ کام کے نام کی سبیلیں لگی ہیں کہیں کیوڑے اور پستہ کی ہوائیوں کا شربت ہے کوئی شش شاہی کے نام

پر دودھ کا شربت بانٹتا ہے کسی نے سقائے سکینہ کی یاد میں مشک کاندھے پہ ڈال رکھی ہے اور تخم بالنگے کا شربت بھر بھر کٹورے بچوں کو پلاتا ہے۔ اب کیا رکھا ہے محرم میں خاک اڑتی ہے امام باڑے امام مظلوم کی مظلومی کا ماتم کرتے ہیں اور عزا خانے حسرت کی تصویر بنے نظر آتے ہیں تعزیے اب تین گھنٹے کے اندر اندر کربلا پہنچ جاتے ہیں اور ایک وہ زمانہ تھا کہ پرانی بزریا پہنچتے پہنچتے ہنڈے آجاتے تھے۔ ایک سے ایک بڑھا ہوا اکھاڑہ ہوتا تھا۔ دلی اور لاہور تک کے خلیفے آتے تھے اور استاد کا ہاتھ چوم چوم کر جاتے تھے۔ استاد کے اکھاڑے کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا مگر اب کیا رکھا ہے نہ اکھاڑوں میں وہ رونق رہی نہ دنگلوں کی وہ شان باقی ہے۔

سچ پوچھو تو یہاں تو استاد کی زندگی ہی میں خاک اڑنے لگی تھی۔ استاد ہو بھی تو گئے تھے بہت بوڑھے نہ وہ عمر رہی نہ وہ پارٹی رہے۔ اپنی کوٹھری میں اکیلے پڑے رہتے تھے۔ الماری میں تین چار چرخیاں پڑی رہ گئی تھیں جن پہ ڈور چڑھی ہوئی تھی انہیں منن چنن کے چلتے بنے آٹھ دس ڈھیاپچی پتنگیں بھی لٹکی نظر آتی تھیں مگر ان پر گرد کی یہ موٹی تہہ جم گئی تھی، منن چنن جب بہت روتے دھوتے استاد انہیں ایک پتنگ دے دیتے اور توبہ کرا لیتے کہ اب پھر کبھی نہیں مانگیں گے۔ پتنگ دینے اور توبہ کرانے کا لگا لگا ہی رہتا تھا اور پتنگیں برابر کم ہوتی چلی جارہی تھیں۔ مردانے کے چبوترے پر چھڑکاؤ ہونا مدتوں سے بند ہو گیا تھا۔ مونڈھے بھی بس دو رہ گئے تھے اور ان کی حالت بھی خستہ تھی۔ باقی سب ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہوئے۔ چوکی کے بھی سارے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اب ملنے والے بھی ایسے کون سے زیادہ آتے تھے کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا آنکلتا تو استاد سے اس سے زیادہ بات وات نہیں کرتے تھے وہ ادھر ادھر کی دو ڈیڑھ بات کرتا۔ استاد ہوں ہاں کرتے رہتے۔ پھر وہ کھڑا ہو جاتا اور استاد کو سلام کر کے اپنا رستہ پکڑتا۔ استاد پھر کسی دوسری دنیا میں پہنچ جاتے۔ چبوترے کے سامنے بازار ہے۔ استاد صبح و شام چبوترے پر آکر بیٹھتے تھے۔ چوکی کے ایک کنارے پہ اکڑوں بیٹھے لٹھیا زمیں پہ ٹیکے وہ گھنٹوں بازار کی بھیڑ کو تکتے رہتے کسی نے چلتے چلتے سلاما علیکم یا نمستے کر دی تو جواب دے دیا نہیں تو گم سم بیٹھے ہیں۔ اللہ اللہ کیا انقلاب آیا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ استاد بڑے ٹھسے سے چبوترے پہ آکے بیٹھتے ارد گرد شاگردوں اور ملنے جلنے والوں کی بھیڑ جمی رہتی پانوں کی تھالی گردش میں رہتی۔ گھڑی گھڑی حقہ تازہ کیا جاتا مجال تھی کہ کوئی چبوترے کے سامنے سے گزرے اور سلام نہ کرے کسی سے چوک ہو جاتی تھی تو استاد کی تیوری پہ بل پڑ جاتے تھے مگر اب تو وہ ان ساری باتوں سے بے نیاز ہو گئے تھے لوگ خود ہی انہیں سلام کا بھی ٹوٹا تھا۔ سلام کرنے والے کچھ مر کھپ کر خاک ہوئے کچھ نیرنگی زمانہ سے آوارہ وطن ہو گئے باقیوں میں سے کچھ نے پرانی وضعداری ہی بنا ہی کچھ نے اسے ترک کر دیا رہے شرنارتھی۔ سو ان غریبوں کو کیا خبر کہ استاد کیا چیز تھے۔ چبوترے کے برابر ہی پیارے پنواڑی نے ایک چوکی بچھا کر پان بیڑی کی دکان جما رکھی ہے۔ استاد نے بہت پہلے سے اسے یہ اجازت دے رکھی تھی۔ اس

کی دکان پہ شرنارتھیوں کے غول کے غول آتے پان کھائے سگریٹ پیئے اور ہنستے کھلکھلاتے چلے جائے۔ کوئی کوئی غصیار اشارتھی استاد کو اک ذرا گھور کو بھی دیکھتا مگر استاد پہ تو اب وہ عالم تھا کہ کسی کے تیوروں پہ نگاہ ہی نہیں رکھتے تھے گھٹنوں چپ چاپ ایک زاویے سے بیٹھے رہتے ان کی نگاہیں خلاء میں جمی رہتیں یا رواں دواں ہجوم کو تکتی رہتیں۔ پھر جب غیر وقت ہو جاتا تو وہاں سے اٹھتے اور خاموش اپنی کوٹھڑی میں چلے جائے مگر ان کی اس اداس خاموشی میں بھی ایک بڑا پن تھا۔ انہیں چوکی پہ اکیلا بیٹھا دیکھ کر یوں لگتا کہ جیسے کوئی سنسان بیابان ہے اور اس میں ایک بہت پرانا اونچا پیپل کا پیڑ ہے جس کے سارے پتے جھڑ چکے ہیں سگا کہتا تھا کہ اپنے زمانے میں استاد کی کاٹھی ہو گی کبھی اچھی مگر اب تو وہ سوکھ کر سینک سلائی ہو گئے تھے بس پکھی سی لگتے تھے۔ ہاں ایک بات وہ ان کی کمر آخر دم تک نہیں جھکی سینہ اب بھی دو انگل اوپر اٹھا ہوا تھا رنگ کھلتا ہوا خشخشی سفید ڈاڑھی کیا گرمی کیا جاڑے ململ کا کرتہ بغیر بنیان کے پہنتے جس میں سے ان کا سرخ سفید بدن جھلک جھلک کرتا رہتا باہر کبھی کبھار ہی نکلتے تھے۔ جب بھی نکلتے سفید چکن کا انگرکھا پہن کر نکلتے ہاتھ میں ایک خوبصورت پتلی سی لاٹھی ہوتی ان کی چال ڈھال میں اب وہ طنطنہ تو باقی نہیں رہا تھا مگر اس میں ایک وقار ایک دبدبہ اب تک موجود تھا۔

استاد اپنی کوٹھڑی میں اب اکیلے ہی رہتے تھے۔ پٹھے ایک ایک کر کے سب چل دیئے رہتے بھی کیسے استاد کا ہاتھ خود تنگ رہتا تھا۔ استاد نے کمایا بہت رکھنا نہ جانا جانے اتنا روپیہ کہاں سے آتا تھا اور کیسے آتا تھا مگر جیسے آتا تھا ویسے ہی جاتا تھا استاد دونوں ہاتھوں سے روپے کی بکھیر کرتے تھے مگر اب تو آمدنی کے وہ سلسلے ہی بند ہو گئے تھے۔ ان کے پٹھے ایک ایک کر کے سب چل دیئے ایک سگا رہ گیا تھا۔ اس نے آخر دم تک استاد کی خدمت کی۔ ادھر ادھر کی خبریں بھی وہی چن چن کے لاتا تھا نہیں تو استاد سے اب کون کچھ کہتا تھا۔ اب تو نئے نئے استاد تھے اور نئے نئے پٹھے تھے کہنے کو تو یہ استاد اور خلیفہ ہیں لیکن بھئی قسم کلام مجید کی استاد کے مقابلے میں تو وہ بالکل سفلے لگتے ہیں وہ بات ہی نہیں۔ نہ وہ دبنگ پن نہ وہ آن بان نہ وہ طنطنہ ہر بات سے چھچھور پن ٹپکتا ہے اور یہ نئے نئے پٹھے جو اپنے آپ کو رستم اور گاما سمجھتے ہیں زور ور تو کیا کریں گے چوما چاٹی کر لیتے ہیں۔ سگا نے ہی استاد کو آ کر یہ بتایا تھا کہ پنڈت والوں نے منگلو کو پگڑی پہنا دی ہے واہ ری خدا کی قدرت منگلو اور پگڑی۔ استاد ہوں' کر کے چپ ہو رہے۔ جب سگا نے پھر ٹھوکا تو جھلا پڑے کہ اب پگڑی بندھتی ہے تو بندھنے دے ہمیں انہوں نے بلایا نہیں ہمیں لڈو نہیں بھیجے۔ ہمیں جب پتہ ہی نہیں تو ہم کیوں اعتراض کریں۔ عجب مزاج ہو گیا تھا استاد کا۔ ہر بات پہ لمبا سا ہوں کر دیتے کوئی زیادہ باتیں ملاتا تو پھر جھلانے لگتے پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ یہ چڑچڑا پن تو اب ان میں پیدا ہوا تھا اب تو بالکل اکل کھرے ہو گئے تھے۔ بات تو بات اب تو انہیں کسی کا پاس بیٹھنا بھی نہیں بھاتا تھا یوں پاس بیٹھنے کو یہاں اب بیٹھا کون ہے بڑی حویلی اب ہو حق کرتی ہے کبھی وہ دن بھی تھے کہ یہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی۔

ایک آرہا ہے ایک جارہا ہے۔ مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مردانے میں رات کو اتنے بستر بچھتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ کوئی برات ٹھہری ہوئی ہے۔ رات گئے تک جاگ باگ رہتی تھی، قصے کہانیاں' گپیں' مشورے قہقہے' آدھی آدھی رات تک بس یہی رہتا تھا صبح کو کسی کی جوتی غائب ہے۔ کسی کا تکیہ پار کردیا گیا۔ کسی کے بستر پہ پانی کا ڈول انڈیل دیا گیا اس پہ آپس میں وہ لڑائی ٹھنتی تھی کہ خدا کی پناہ۔ احمق بننے والے احمق بھی بنتے تھے۔ نقصان بھی اٹھاتے تھے۔ شریر شرارت بھی کرتے' دوسروں کو بھرے میں لاکر لڑا بھی دیتے اور پھر اچھے کے اچھے مگر اب یہ لوگ کہاں ہیں سب چڑیاں سی اڑ گئیں۔ ساری بڑی حویلی سائیں سائیں کرتی ہے مردانے میں دو ڈھائی بڈھوں ٹھڈوں کی چارپائیاں پڑی ہیں۔ ان کا کیا اعتبار' آج کھانسے کھنکارتے ہیں۔ کل ایسے سوئیں گے کہ سانس نہیں لیں گے جو جوان تھے وہ ایسے غائب ہوئے ہیں کہ برسوں سے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ اب ان کی صورت کیا دیکھے گی۔ وہ دوسرے ملک کے ہو رہے اس گھر پہ یہ افتاد پڑی تھی ایک مشن بھائی ضرور یہاں ہیں سوجیں تو انکی نیت میں بھی فتور نظر آتا ہے خیر ان کا دم غنیمت ہے۔ ان کی وجہ سے کبھی کبھی اس چبوترے کی قسمت تو جاگ ہی اٹھتی ہے۔ مجو میاں جمیل بھائی' ہاشمی صاحب اور نہ جانے کون کون آ بیٹھتے ہیں اور پھر باتیں شروع ہو جاتی ہیں جمیل بھائی بھی خوب ہیں۔ ویسے تو بات اردو میں کریں گے لیکن جہاں ذرا جوش میں آئے جھٹ گٹ پٹ شروع کر دیتے ہیں۔ خیر صاحب وہ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن مجو میاں کیا ہیں جو انگریزی میں ٹانگ اڑاتے ہیں پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل' انہوں نے بھی بھیا پڑھ کے ہی نہیں دیا۔ ہر سال فیل ہر سال فیل۔ ایک دفعہ بڑی شرم آئی تھی تو پٹڑی پہ جا لیٹے تھے ساتھ میں بنئے والے کو بھی لے گئے۔ خود تو ریل کی آواز سن کے بھاگ آئے۔ اس بچارے بنئے والے کو مفت میں کٹوا دیا۔ مجو میاں بھی بس اللہ کے جی ہیں۔ بالکل گوبر گنیش کچھ نہیں آتا جاتا۔ بس دو باتوں کی انہیں فکر رہتی ہے کھانے کی اور ممبری کی۔ دعوت ہووے ہے تو ایسے منڈے ہیں کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ انہیں کچھ ہی جاؤ کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔ چکنا گھڑا ہیں چکنا گھڑا کھانے کی چیز کو تو کسی قیمت نہیں چھوڑتے لیکن اپنی گانٹھ سے کبھی خرچ نہیں کرتے بڑے کنجوس مکھی چوس ہیں۔ دھیلا جو خرچ کر دیں کسی پہ بس جی ان کا پیسہ کسی کو لگا ہے تو وہ گدی والا ہے۔ اسے تو خوب چٹاتے ہیں ہاشمی صاحب نے بھی صاحب ہزار مرتبہ کہا ہوگا کہ ابے مجو سالے یہ تیرا سارا پیسہ کیا اس پیچ گدی والے پہ ہی بھینٹ چڑھنے کو رہ گیا ہے۔ کبھی تو اپنے داداؤں کی دعوت کر کرا دیا کر۔ لیکن وہ ایک کان سنتے ہیں دوسرے کان اڑا دیتے ہیں۔ ایک ممبری کا خناس ان کے دماغ میں سما گیا ہے پہلے کانگرس میں تھے پھر لیگ میں ہوئے اب پھر لیگ سے فرنٹ ہیں اور کانگرس جانے کی سوچ رہے ہیں۔ پر انہوں نے ہزار جتن کئے مگر ممبر ہی نہ بنے۔ اجی کیا ممبر بنتے زاغلولو ہیں بالکل۔ لیکن خیر زاغلولو تو یہ سب ہی ممبر ہووے ہیں جنھیں یہ کیا بات ہے کہ ہمارے ہاں جتنے زاغلول ہیں سب ممبری کے

چکر میں رہوے ہیں اور جی یہ جو روپیہ ممبری پہ پانی کی طرح بہاوے ہیں بعد کو انہیں کیا مل جاوے ہے چوکھا حساب تو جمیل بھائی کا تھا۔ سرکار کو دو چار سلام جھکا آئے اور مزے سے سرکاری ممبر بن گئے مگر اب تو وہ ٹھاٹ ہی ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں جمیل بھائی کے ٹھاٹ تھے۔ سارے کلکٹروں' کمشنروں سے یاد اللہ تھی جب کبھی کوئی دورے پہ آیا ان کے یہاں ٹھہرا۔ افسروں کو انہوں نے بڑی مرغیاں کھلائیں ہیں۔ شیخی کی بات تو نہیں استاد کبھی کسی افسر کو سلام کرنے نہیں گئے اور بھئی استاد اگر ممبری کیلئے کھڑے ہو جاتے تو کیا ممبر نہ بن جاتے۔ کیا ہندو کیا مسلمان استاد کو سب مانتے تھے مگر وہ تو ایسے چکروں میں کبھی پڑے ہی نہیں اور اب تو وہ سارے ہی ہنگاموں سے بیزار تھے۔ اب تو انہیں ہنسنے بولنے سے بھی بیر ہو گیا تھا۔ اب یہی دیکھ لو کہ مشن بھائی کی ٹولی جہاں جمی اور ٹھٹھے لگنے شروع ہوئے استاد پھر نہیں نکلتے تھے۔ کھانستے کھنکارتے اپنی کوٹھری میں چل دیتے تھے۔ پچھلے دنوں شمی آیا تھا استاد نے اس سے بھی ایسی بات وات نہیں کی۔ شمی اب اگر چلا گیا ہے پہلے استاد کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کا بڑا اچھا بدن تھا۔ استاد اسے بڑا ہونہار پٹھا سمجھتے تھے لیکن بدن تو کھلائی سے نکلتا ہے۔ محنت مزدوری میں کیا خاک کھلائی ہوتی۔ اس کی وہ بات ہی نہیں رہی۔ استاد تو اونگھتے اونگھتے سو گئے کوئی بارہ ایک بجے تک وہ سگا سے باتیں کرتا رہا۔ سگا نے بھی اسے ادھر ادھر کی ساری باتیں بتا ڈالیں۔

کہنے لگا بیٹا شمی اب تو یاں خون کی ندیں بہیں گی۔

شمی کو جیسے دین دنیا کی خبر ہی نہیں تھی چونک کے بولا کیا ہوا بے؟

سگا اس کے اور قریب سرک آیا اور کہنے لگا۔ یہ سالے تو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں دیکھنا کوئی بنیا ایسا نئیں ہے جس کے گھر میں تیزاب اور پسی ہوئی مرچیں نہ ہوں۔ رات بھی حلوائیوں والی گلی میں بیسیوں لٹھیا گئی ہے۔ لیکن شمی ہمارے پاس بھی ایک ایک سیگ ایسا ہے کہ ان کی بھلیاں بکھیر دے گا۔

شمی جماہی لیتے ہوئے بولا ابے یار یہ ہم سے کیا لڑیں گے۔ اور ابے ہاں سگا یہ تو بتا کہ یاں کوئی پٹھا وٹھا بھی نکل رہا ہے۔

پٹھا؟ نکل لئے پٹھے گئی ہوا بھیا ایک خوانچے والے کو سمجھ لو اور پھر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولا استاد کا زمانہ ہی نہ رہا نہیں تو ہیں۔ اور بھی شمی تو ہی انصاف سے کہیو استاد تو برا مان جاوے ہیں میں نے ہزار مرتبے کہا کہ استاد اب پہلا سا وخت نئیں رہا۔ یہ گھر بتیس دانتوں کے بیچ میں زبان ہے پہلی بات اور تھی کسی سالے کی ہمت نئیں تھی کہ اس چونترے کے پاس سے بغیر سلام کئے نکل جاتا۔

شمی تاؤ میں آ کر بات کاٹتے ہوئے بولا اجی کوئی سالا بغیر سلام کئے جا سکے تھا سالے کے بکل اڑا دیتے بکل۔

سگا کو اور جوش آیا۔ اماں وہ نئیں اے کہ استاد گلی میں نکل رئے تھے للو پنساری چارپائی پہ بیٹھا رہ گیا۔ وہیں سے سالے کو ہنٹر دیا

سانٹر سے اس کی آواز یکا یک مدھم پڑ گئی مگر بھیا اب وہ زمانے کہاں ہیں اب اسی للو پنساری کا لونڈا اکھاڑے میں جا کے زور کرے ہے شمی نے اکتا کر ایک لمبی سی جماہی لی یہ بیچ سالے زور کر کے ہی ہماری کیا پونچ اکھاڑ لیں گے ابے او پیارے ابے کیا بج گیا ہے۔

پہلوان بارے

بارے۔۔۔۔دھت تیری ماں کی دم میں کھنکھنا۔۔۔۔۔۔یہی جگہ رہ گئی ہے رونے کے لئے۔

بلی سٹاک سے نالی میں غائب ہوگئی۔

اس سال بلی کی بھی کچھ نہ پوچھو۔ اگر اسے ڈانٹیں نہیں تو ساری رات بھر رو دے استاد کو بڑھاپے میں یہ نیا شوق سوجھا تھا پٹھے تو دو گیارہ ہوئے تو انہوں نے بلی پال لی۔ استاد اسے بہت پیار کرتے تھے مگر ہمیں تو یہ بہت منحوس نظر آتی ہے اجی سچ پوچھو تو اس کے رونے سے ہی اس گھر پہ ساری بربادی آئی ہے۔ جب سے یہ آئی اور رونا شروع کیا یہ گھر برباد ہوتا چلا گیا۔ جب ہندو مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تھی تو سارا محلہ ہی خالی ہو گیا تھا اور اس کا یہ حال تھا کہ اس چھت پہ گئی روآئی۔ اس چھت پہ گئی روآئی۔ صاحب اس لڑائی کا حال نہ پوچھو۔ دل کانپتا ہے سوچ سوچ کے۔ دیکھنا یہ ساری سڑک خالی پڑی رہتی تھی۔ بس ایک سناٹا سا تھا۔ کبھی کبھار سپاہی کھٹ کھٹ کرے نکل جاتے یا ایک ساتھ خوب شور ہونے لگتا۔ اس کے بعد سناٹا اور دوگنا چوگنا آٹھ گنا ہو جاتا۔ پیارے کی دکان پہ کہاں تو اتنا جمگھٹا رہتا تھا کہ بینچ پر بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی اور کہاں یہ حال تھا کہ ایک کالا مریل کتا اس پہ لوٹ لگایا کرتا تھا اور یہ کوے ویسے تو انہیں منڈیروں اور کولہوں پر بھی کوئی بیٹھنے نہیں دیتا مگر اس زمانے میں تو وہ بیچ سڑک پہ چہل قدمی کیا کرتے تھے پھر ایکا ایکی آگیں لگنی شروع ہوگئیں۔ جب یاسین بساطی کی دکان پہ آگ لگی تو بس ہماری تو جان ہی نکل گئی وہ بھی کیا آگ لگی تھی یہ بڑے بڑے ٹرنک اور صندوق جل جلا کے کھڑنک ہو گئے یاں ایسی ایسی چمکیلی چیزیں تھیں کہ ہماری تو آنکھیں چکا چوند کھا جاتی تھیں۔ ساری دکان بس جگمگ جگمگ کرتی رہتی تھی۔ لیکن اب تو سارے میں کالونس پتی ہوئی تھی۔ بس ایک چوہوں کی آنکھیں ضرور چمکتی رہ گئی تھیں رات بھر کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرتے تھے اور جب جلے پھکنے ٹرنکوں میں دوڑتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے جن چل رہے ہوں اماں استاد کو دیکھو کہتے ہیں کہ زٹیل سالے آگ لگائی ہے جیسے پھلجڑی چھوڑ دی۔ اس سے زیادہ تماشہ تو ہم شب برات کی لڑائی میں کر دیا کرتے تھے مشن بھائی کے اوسان خطا تھے اور استاد کہویں کہ میں یاں سے سرکوں نہیں بھئی استاد بھی بہت ضدی تھے۔ مشن بھائی نے لاکھ سر مارا لیکن وہی اپنی جگہ سے نہ سرکے۔ آخر کیا کرتے ہم تو وہاں سے اڑ لئے۔ بعد میں بڑا خون خچر ہوا صاحب اس لڑائی میں بھی بڑا آدمی مارا گیا مگر آدمی بیچ ذات کا زیادہ مارا گیا۔ ہمارے گھر پہ تو اللہ نے بڑا فضل کیا کسی کی ناک کی نکسیر بھی نہ چھوٹی خیر باقی لوگ تو چلے گئے تھے۔ مگر استاد تو

یہیں جمے رہے تھے۔ ان کا بال بیکا نہ ہوا۔ استاد نے بھی صاحب بڑی ہمت دکھائی۔ یہاں بھلا کیا کیا نہیں ہوا۔ اسی چبوترے کے سامنے سڑک پہ نہ جانے کتنے قتل ہوئے سڑک کے دوسری طرف پنجابی بساطیوں کی دکانیں تھیں۔ پہلے یاسین بساطی کی دکان میں آگ لگی۔ پھر لائن کی لائن صاف ہوگئی۔ دکانیں رات بھر دھنڑ دھنڑ جلتی تھیں اور استاد اور سگا دودم بڑی حویلی کی چوکسی کرتے تھے' کئی راتیں انہوں نے آنکھوں میں کاٹ دیں مگر استاد کا بھرم رہ گیا۔ چاروں طرف خون خرابہ ہوتا رہا آگیں لگتی رہیں مگر بڑی حویلی کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ خیر یہ فساد تو ختم ہوگیا لیکن قیامتیں تو اس کے بعد بھی آئیں اور ایسی قیامتیں آئیں کہ بڑی حویلی کی بنیادیں ہل گئیں ہاں نہ ہلے تو استاد اپنی جگہ سے نہ ہلے ایک بڑی حویلی پہ کیا موقوف ہے دنیا ادھر سے ادھر ہوگئی۔ زمانہ دیکھتے دیکھتے بدل گیا محلے خالی ہونے لگے۔ بھری بستیاں اجڑنے لگیں لوگ ایمان بچانے کے بہانے جانیں بچا بچا کر لے گئے۔ استاد نے اسی چبوترے پہ بیٹھ کے کربلائیں بھی ہوتے دیکھیں اور میلے بھی ڈھلتے دیکھے مگر ان کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔ اسی طرح چپ چاپ کوٹھڑی سے نکل کے آتے اور چوکی پہ اکیلے ٹوٹروں سے بیٹھے رہتے سڑک سنسان ہو'اس پہ اکا دکا سہمے ہوئے چہرے یا خونخوار صورتیں نظر آئیں یا سپاہی ٹہلتے دکھائی دیں' ان کی بلا سے ان کی نگاہیں سڑک پر تو نہیں ہوتی تھیں بس خلا میں جمی رہتی تھیں۔ گھنٹوں گم متھان بنے بیٹھے رہے اور پھر چپ چاپ کوٹھڑی میں چلے جاتے۔ شاید ان کی خاموشی اب اور بڑھ گئی تھی۔ یہ خاموشی اور بڑھی اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ خاموش ہونے والے خاموش ہو جاتے ہیں مگر تھوڑی دیر کے لئے رونے پیٹنے کا ہنگامہ تو گرم ہو ہی جاتا ہے استاد کی موت پہ یہ بھی نہ ہوا۔ خاموشی سے دفنا دیئے گئے اسی بڑی حویلی کے چبوترے سے ہم نے استاد کے بہت سے جلوس نکلتے دیکھے تھے اور یہ آخری جلوس بھی نکلتے دیکھا استاد یہ معرکہ بھی شاید ہارے تو نہیں تھے مگر جلوس میں وہ دھوم دھام دھڑ کا نہ تھا۔ استاد تھک گئے تھے ہارے نہیں تھے تھکے ہوئے پہلوانوں کا جلوس شاید اسی طرح نکلتا ہو۔

استاد چلے گئے بڑی حویلی کا جو تھوڑا بہت بھرم تھا وہ بھی ختم ہوا۔ اب یہاں کیا رکھا ہے خاک اڑتی ہے' استاد سارے ہنگامے اپنے ساتھ لے گیا۔ اب تو بڑی حویلی ڈھنڈار سی نظر آتی ہے۔ باقی پٹھے پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ ایک سگارہ گیا تھا۔ سو وہ بھی پاکستان چلا گیا۔ مش بھائی خود چوبیس گھنٹے پاکستان جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ بڑی حویلی کے دام اٹھ جائیں ابھی بڑی حویلی بکے گی تو کیا اس بس تالا ہی پڑے گا دیکھ لینا کسی روز یوں ہوگا دو ڈھائی بڈھے جو مرد نے میں پڑے کھانستے رہتے ہیں چپکے سے ملک عدم کو کھسک جائیں گے اور مشن بھائی پاکستان کا رستہ لیں گے۔ بڑی حویلی میں تالا پڑ جائے گا گھر یونہی بستے اجڑتے رہتے ہیں اور میاں گھر تو گھر بڑے بڑے شہر اجڑ جاتے ہیں اور ایسے اجڑتے ہیں کہ ان کا کوئی نام لینے والا نہیں رہتا۔ اس زندگی کی کچھ نہ پوچھو

اسے تو بس بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھو۔ جو دن خیر سے گزر جائیں غنیمت ہیں بھیا کچھ نہیں سب جھوٹا جھگڑا ہے۔ بس ایک اللہ پاک کی ذات سچی ہے۔ دوغلی دنیا اس سالی سور کی بچی کے ساتھ تو بس یوں کرے کہ دو پیسے کا مٹی کا تیل چھڑک کے یاسین بساطی کی دکان کی طرح بھک سے اڑا دے۔